دکن میں اردو

یعنی

جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا اور اس کی ترقی

مؤلفہ

نصیر الدین ہاشمی (منشی فاضل)

مطبوعہ

نظام دکن پریس موقوعہ بازار عیسیٰ میاں حیدرآباد طبع شد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دکن میں اردو

یعنی

جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا اور اسکی ترقی

مقدمہ

گلستان ہند کے شمالی چمن میں مغربی دروازوں سے باغبانوں نے آکر اردو کا بیج بویا گنگا جمنانے آبیاری کرکے چھوٹے سے پودے کو اگایا۔ اسی کے قریب قریب گلزار دکن میں بھی انھیں لوگوں نے اس بیج کو زمین میں ڈالا۔ کرشنا اور موسیٰ درخت کے اگانے میں معاون ہوئیں۔ ہنوز شمالی چمن کا درخت بارآور نہ ہوا تھا کہ دکھنی پودا زمین کی عمدگی اور بروقت آبیاری سے بہت جلد تر و تازہ سرسبز و شاداب ہوگیا لیکن قبل از وقت بارآوری سے پھلوں میں کثرت ہوکر زیادہ مٹھاس باقی نہ رہی۔

اسی اثنا میں ایک دکھنی باغبان نربدا کے اس پار جا پہونچتا ہے۔ اور اپنے فن زراعت سے شمالی چمن کے درختوں کی پرداخت کرتا ہے پرانی شاخیں قطع و برید کرکے چمن کی آراستگی میں مصروف ہوجاتا ہے۔ پھر تو تھوڑی ہی مدت میں چمن سرسبز اور درخت بارآور ہوجاتے ہیں چمن نئے نئے گل بوٹوں سے اپنی بہار دوبالا کردیتا ہے۔ پھر ایک زمانہ آتا ہے کہ بہار کا موسم ختم ہوجاتا ہے۔ خزاں اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ باغ کے خوبصورت پھول مرجھا جاتے ہیں۔ درخت عریاں چمن تاراج اور باغباں برباد ہوجاتے ہیں۔

عہد گل ختم ہوا ٹوٹ گیا ساز چمن　　　اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پرداز چمن

جمنا کے ساحل کو ایسی حالت میں پاکر کچھ باغبان گومتی کے کنارے جا پہونچتے ہیں اور وہاں کے چمن کی آراستگی اور درختوں کی آبیاری میں مشغول ہوجاتے ہیں مگر یہاں بھی ان کو قیام اور دوام حاصل نہیں ہوتا کچھ عرصہ تک ستلج کی وادی میں قیام کرنے کے بعد وہاں اپنی نشانیوں کو چھوڑ کر اپنے قدیم امن و مسکن و مکن کی طرف پلٹ آتے ہیں۔

یہاں کا چمن گو خزاں سے برباد نہ ہوا تھا درخت پھلوں سے خالی نہ ہوئے تھے پھول زمانہ کی نیرنگیوں کے باعث کھلانے گئے تھے تاہم عمدہ مصالح اور نئے مصلحوں کی ضرورت تھی تاکہ طرز جدید کے آلات اور نو ایجاد گھاد کو جو یورپ کے گلزاروں کی چمن بندی میں کارآمد تھے استعمال کریں باغبانوں نے اس گر کو دریافت کرلیا اور نئے ساز و سامان کے ساتھ چمن کی آراستگی میں مشغول ہوگئے۔

صفحات آیندہ آپ کو اس کی حقیقت سے بخوبی آگاہ کریں گے اور میرے مافی الضمیر کو روشن کردیں گے تاہم اس امر کا خیال ہے کہ میں نہ تو انگریزی سے واقف ہوں اور نہ عربی و فارسی سے کما حقہ آگاہ۔ مجھے اس امر کا دعویٰ نہیں ہے کہ میں انشا پرداز یا مضمون نگار ہوں نہ تو مجھ کو شاعری و سخن سنجی میں دخل ہے اور نہ شعر فہمی کا ذوق ان تمام امور کے لحاظ سے میری تالیف کا کیا رتبہ ہونا چاہئے خود ناظرین غور فرماسکتے ہیں۔

مگر اس میں شک نہیں میں نے تلاش و تجسس اور غور و مطالعہ کے بعد اس کو مرتب کرنے کی جسارت کی ہے سب سے بڑی دشواری فراہمی مواد کی تھی کیونکہ ایک امر کے دریافت کرنے کے لئے پوری کتاب کا مطالعہ کرنا ضرور ہوتا تھا۔ مغربی ممالک کے پریس اس امر کا خاص انتظام رکھتے ہیں کہ جو کتاب طبع ہو اس کے مضامین اور جن جن امور کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہو اس کی فہرست مرتب اور کتاب کے ساتھ لگادی جاتی ہے جس کے باعث اہل مغرب جب کوئی تصنیف یا تالیف کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو ان کے لئے فراہمی مواد میں دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے ایشیائی افراد خصوصاً اہل ہند کے لئے یہ آسانی نہیں ہے کیونکہ یہاں عموماً کتاب کے ساتھ فہرست کے نہ ہونے سے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ مطلوبہ داخلہ کس صفحہ پر درج ہے البتہ مغربی ممالک میں جو کتابیں عربی زبان کی شایع ہوتی ہیں ان میں یہ انتظام ملحوظ رکھا جاتا ہے چنانچہ مولانا شبلی مرحوم نے بھی اس خوبی سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ مصر اور بیروت میں بھی اس اصول کی پابندی کی گئی ہے میں نے جو کچھ لکھا ہے مستند کتابوں سے لکھا ہے اگرچہ ابتدا میں میرا ارادہ ایک مختصر مضمون لکھنے کا تھا لیکن جب میں نے لکھنا شروع کیا تو مضمون طویل ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ ایک کتاب کی سی

صورت ہوگئی۔ اس کتاب میں میں نے اُن اصحاب کے کلام کو بھی پیش کیا ہے جو دکھنی نہ تھے بلکہ یہاں صرف بود و باش اختیار کرلی تھی اور یہیں پیوندِ زمیں ہوئے۔ میں نے اس امر کو اس لئے جائز رکھا ہے کہ میر اور غالب جن پر دہلی ناز کرتی ہے وہ درحقیقت دہلی کے نہیں تھے بلکہ آگرے کو ان کا وطن ہونے کی عزت حاصل تھی لیکن انھوں نے دہلی میں بود و باش اختیار کرلی تھی اور دہلی ہی کے ہو رہے تھے اس لئے وہ دہلوی مشہور ہوگئے۔ میر لکھنؤ میں آکر پھر نہ دہلی گئے نہ آگرہ وہیں ان کا مدفن ہوا۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے میں نہ شاعر ہوں اور نہ سخن فہمی و سخن سنجی کا مدعی۔ پس جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں اپنی استعداد اور اپنی پسند کا لحاظ رکھا ہے۔ درحقیقت ہر شخص کا انتخاب اسکے مذاق کے مناسب ہوسکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کا مذاق یکساں نہیں ہوسکتا۔ کسی کو سوز و گداز پسند ہوتا ہے تو کوئی شیرینی و لطافت کا دلدادہ ہوتا ہے کوئی کلام کی سادگی کو پسند کرتا ہے تو کوئی رنگینی اور نزاکت کو غرض یہ ناممکن ہے کہ ہر ایک کا مذاق یکساں ہو۔ اگر ناظرین کو انتخاب میں کوئی سقم نظر آئے تو اس میں میرے مذاق کا قصور اور کمی ہوگی نہ کہ شاعر کا نقص۔

المختصر میری دو سالہ محنت کا جو کچھ ثمرہ ہے وہ ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش ہے فقط

خاکسار

نصیر الدین ہاشمی

حیدرآباد دکن

۷؍ صفر سنہ ۱۳۴۲ھ

جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا اور اسکی ترقی

تمہید | کوہ بندھیاچل کا جنوبی حصہ بھی علم و ہنر کی ترقی میں دنیا کے اور کسی حصہ ملک سے کم نہیں رہا اس سرزمین نے بھی وہ باکمال ہستیاں پیدا کیں جنھوں نے گلشن گیتی کے چمن کو رنگ رنگ کے علمی گل بوٹوں سے آراستہ و مزین کیا اور اپنی ظاہری ہستی کو نابود کرنے کے بعد بھی صفحہ روزگار پر سرسبز اور شاداب علمی گلشن اپنی یادگار چھوڑ گئے۔

ہندوستان کے مشہور مورخ فرشتہ اور فارسی کے نامور باکمال شاعر ظہوری نے یہیں اپنی عمر بسر کی بلبل ہزارداستان[1] ایران کو پیغام طلب گیا۔ علاوہ ازیں سلطنت بہمنیہ کا مشہور مدرسہ جس کے کھنڈر اب تک بیدر میں اپنے بانی محمود گاواں کی یاد تازہ کرنے کے لئے موجود اور زبان حال سے گویا ہیں کہ میرا بانی تعلیم سے کیسا گہرا ذوق کیسی دلچسپی اور اصلاح قومی کے لئے کیسا بے چین دل رکھتا تھا۔

اسی کی خاک میں مولانا عبد العلی بحر العلوم چشم و چراغ فرنگی محل آرام فرما رہے ہیں۔ اور سرزمین دکن ہی کو اس امر کا فخر حاصل ہے کہ اردو کا نہ صرف پہلا شاعر اور مذہبی و علمی تصانیف کا موجد یہیں سے جلوہ نما ہوتا ہے بلکہ اردو زبان کی یونیورسٹی قائم ہو کر چار دانگ عالم میں اپنا غلغلہ بلند کرتی ہے۔

اردو کی ابتدا | جب ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ بود و باش اختیار کرتی ہے تو یہ امر ناگزیر ہے کہ بول چال کام کاج میں ایک کے الفاظ دوسرے کی زبان میں منتقل ہوں۔

ہندوستان ہمیشہ غیر اقوام کا آماج گاہ بنا رہا ہے ایرین قوم نے شمالی ہند پر حملہ کیا اور یہاں کے قدیم باشندوں کو جنوب کی طرف ہانک دیا۔ ان لوگوں کی زبان تامل اوڑیا اور تلنگو وغیرہ تھی۔ چنانچہ آج تک دکن میں یہ قدیم زبانیں مروج ہیں۔ فاتحین نے خیال کیا کہ عام شودروں (مفتوح) کی زبان سے اپنی زبان بلند پایہ ہونی چاہیئے چنانچہ انھوں نے قواعد و اصول ترتیب دئے اور اپنی زبان کا نام سنسکرت رکھا لیکن ان کی سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آکر کچھ اور ہو گئے اور ہوتے ہوتے پراکرت زبان خود بخود پیدا ہوی۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ پراکرت زبان ہی کل شاہی دفاتر اور دربار کی زبان ہو گئی۔ عام طور سے مذہبی کتب وغیرہ اسی زبان میں مرتب ہونے لگے۔

لیکن تخمیناً پندرہ سو سال بعد جبکہ راجہ بکرماجیت کے سر پر تاج شاہی آیا تو قدیم سنسکرت زبان کو

---

[1] سلطان محمود شاہ بہمنی نے خواجہ حافظ شیرازی کو طلب فرمایا تھا مگر بعض وجوہ سے وہ نہیں آئے۔ فرشتہ

پھر سے عروج حاصل ہوا اور وہ آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگی۔ غرض اس طرح شاہی دربار امرا اور پنڈتوں کی زبان سنسکرت رہی مگر عوام میں وہی پراکرت مروج تھی جو برج بھاشا کی اصل ہے۔

اسی حالت میں مسلمانوں نے حملہ کیا اور عربی فارسی اور ترکی الفاظ کا امتزاج برج بھاشا میں ہونے لگا جب مغربی اقوام نے سرزمین ہند میں قدم رکھا تو اُن کے لفظ بھی داخل ہونے لگے۔ غرض اس طرح برج بھاشا میں عربی فارسی ترکی انگریزی پرتگالی الفاظ مل ملاکر ایک نئی زبان مروج ہوگئی جو حسب روایت آزاد مرحوم شاہ جہاں کے زمانہ میں اردوئے معلی کے مبارک نام سے نامزد ہوی۔ یہاں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اردو کی ابتدا شاہ جہاں کے زمانہ سے نہیں ہوی بلکہ صرف اس زمانہ میں اس نام سے موسوم ہوی ورنہ ابتدا تو بہت پہلے ہوچکی تھی۔

فیلن اپنی کتاب طبقات الشعرا میں لکھتا ہے کہ "گیارھویں صدی عیسوی کے قبل تمام ہندوستان میں وید کی زبان کے خلاف ایک اور زبان مروج تھی اور راجہ بھرت کے عہد حکومت میں بھاشا کو فروغ شروع ہوا۔ ہنوز بھاشا نشوونما کی حالت میں تھی اور اس کی تکمیل نہیں ہوی تھی کہ محمود غزنوی نے ہند پر متواتر حملے شروع کردئیے۔ حتیٰ کہ بارھویں صدی میں پٹھانوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ اور اقتضائے وقت کے بموجب ان دو اجنبی قوموں کے درمیان بات چیت لین دین خرید و فروخت اور دوسرے معاملات کے افہام و تفہیم کے لئے ایک جدید اور مرکب زبان کی بنیاد پڑی۔ تیمور کے فتوحات سے اسے ترقی اور استحکام ہوا۔ لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں کی زبان اس وقت تک فارسی تھی اور جس طرح آج کل انگریزی دانی کے بغیر معاملات زندگی ادھورے اور بے لطف رہ جاتے ہیں اس ابتدائی زمانہ میں یہی کیفیت ہندوؤں کی تھی یعنی بطور قاعدہ کے مفتوح کو ضرورتاً فاتح قوم کی زبان سیکھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اسی طرح ہندوؤں نے فارسی سیکھنے میں کوشش کی اور اردو جس کا بیج محض زمین میں دبایا گیا تھا اب اس نے چند فٹ کا قد حاصل کیا۔ تیمور کے زمانہ میں ہندو مسلمانوں کے ربط ضبط اور روزانہ مراسم نے جنوبی ہند میں بھی ایک زبان کی بنیاد ڈالی جسے آج "دکھنی" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔"

اس سے ظاہر ہے کہ جو نتیجہ آپس کے میل جول سے شمالی ہند میں رونما ہوا اس کا اثر رفتہ رفتہ جنوبی ہند میں بھی ہوتا گیا۔ جب دکن میں پہلے پہل اسلامی سلطنت بہمنیہ قایم ہوی تو چونکہ اس خاندان کا بانی حسن تورانی النسل تھا اس کی مادری زبان فارسی تھی اس لئے یہاں کی سرکاری زبان فارسی قرار دی گئی لیکن عام طور پر اردو عام خانگی زبان کے طور پر مستعمل تھی۔ امیر سے غریب اور ادنیٰ سے اعلیٰ تک ہر شخص اسی دکھنی زبان میں گفتگو کیا کرتا تھا حتی کہ صاحب حال درویش بھی اسی زبان میں اپنا کمال ظاہر کیا کرتے تھے

چنانچہ حضرت خواجہ بندہ نواز کے والد نے جن کا انتقال ۷۳۱ھ ہجری میں ہوا اپنا تخلص راجار کھا تھا جو آج تک شاہ راجو یا سید راجا کے نام سے مشہور ہیں اور اسی طرح حضرت زین الدین خلد آبادی متوفی ۷۷۱ھ کا آخری کلام (منجہ مت بلا وہ) مشہور ہے[1]۔ علاوہ ازیں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۸۲۵ھ ہجری کی جانب حسب ذیل اشعار منسوب کئے جاتے ہیں۔

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھنا اُسے — جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یوں کھوے خودی اپنی خدا ساتھ محمد — جب گھل گئی خودی تو خدا بن کوئی وہے
آنتوں بلبیلہ و آنتوں لون — پیتن کے گھر جائے کون[2]

گو اس کے صحت میں ایک حد تک کلام ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں ۸۰۰ھ میں دکن میں اردو یا دکھنی مروج تھی۔

غرض اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکھنی یا اردو کا آغاز شاہ جہاں کے دور کی یادگار نہیں بلکہ اس کے بہت پہلے اس کی ابتدا ہو چکی تھی۔

اردو کی نشو و نما کسی شاہی فرمان یا علما کے فتوے یا کسی مجلس کے مشورہ سے نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کا وجود محض اجتماع و اختلاط کا لازمی اثر تھا اور پیدا نہ ہونا باعث حیرت و تعجب ہوتا۔

اردو نظم کی ابتدا | شاعری کا انسانی ترقی میں خاص حصہ رہا ہے اخلاق کی تہذیب اور تمدن کی اصلاح میں جو کارنامے نمایاں اس سے ظہور میں آئے ہیں وہ اور وسائل سے نہیں آئے۔ نظم کے باعث ہی فطری ولولے جوش میں آتے اور قدرتی جذبات کو حرکت و جنبش ہوتی ہے۔

اس امر کا ٹھیک پتہ لگانا نہایت دشوار ہے کہ پہلے کس زبان میں نظم کی ابتدا ہوئی۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں جس قدر زبانیں عالم وجود میں آئیں ان میں اول نظم ہی کا رواج ہوا ہے کیونکہ نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے اسی لئے قدیم زمانہ میں مذہبی کتابیں نظم ہی میں قلمبند ہوا کرتی تھیں یا سنسکرت میں عرفان حقیقی اور فلسفہ و حکمت کا اشراقی کام نظم کے ذریعہ ہی سے وابستہ تھا۔ زمانہ جاہلیت میں جبکہ عرب میں کتابت کا دستور نہ تھا سیکڑوں ہزاروں اشعار عرب زبانی یاد رکھتے تھے۔ دنیا میں عرب کے سامنے کوئی قوم خلاقی شاعری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح فارسی زبان میں شاعری سے بڑے

---

[1] منقول ہے کہ جس وقت آپ کے وصال کا وقت قریب ہوا تو آپ کے مرید عرض کرنے لگے کہ وصیت کی جائے اور کوئی خلیفہ مقرر کیا جائے۔ اس پر آپ نے پہلے تو منہ پھیر لیا اس کے بعد جب آپ کے ایک مرید خادم نصیر الدین بدھیری نے دوبارہ یاد دہانی کی تو اس وقت فرمایا کہ منجہ مت بلا وہ (مجھے مت بلاؤ) (روضتہ الاقطاب تاریخ خلد آباد مصنفہ روشن علی مطبوعہ)

[2] رسالہ النساء جلد (۲) نمبر ۱۰ و ۱۱ (تکملین) سے مشکوٰۃ ...

بڑے کام لئے گئے اور شاعری کو بادشاہوں کی خلوت جلوت رزم و بزم سے خاص تعلق رہا شاعروں کی اعلیٰ سے اعلیٰ عزت کی گئی۔ یہاں تک کہ انھیں ملک الشعرا کا خطاب دیا گیا۔ حسب دستور اردو میں بھی نظم کی ابتدا پہلے ہوی اور اس کا سہرا دکن ہی کے سر ہے۔ قبل اس کے کہ دہلی اور لکھنو میں اردو نظم کا رواج ہو یہاں اردو نظم کی مکمل شکل پیدا ہو چکی تھی۔

جب دکن کی اسلامی سلطنت بہمنیہ شکست ہو کر بیجاپور گولکنڈہ اور احمد نگر وغیرہ میں سلطنتیں قایم ہو گئیں تو یہاں اردو کو اور زیادہ ترقی نصیب ہوی کیونکہ سلاطین دکن کے محلوں میں ہندی رانیاں آئیں والی احمد نگر احمد نظام شاہ[1] اصلاً برہمن تھا اسمعیل عادل شاہ کی ماں دکنی تھی۔ سلاطین کی تعصب سے ہند و سلطنت کے مشیر تھے ان حالات کے لحاظ سے ابراہیم عادل شاہ متوفی ۹۶۵ھ کے زمانہ میں شاہی دفتر فارسی سے دکھنی زبان میں آگیا۔[2] آخر کچھ دنوں بعد عام زبان ہونے کا شرف حاصل کر لینے کے علاوہ اہل علم و ادب کے اظہار خیالات کا آلہ بھی بنی اور یہاں کی علمی چہل پہل بھی رنگ لائی۔ اردو جواب تک صرف بول چال کے کام کاج میں آتی تھی۔ نظم کی صورت میں کتابت میں آنے لگی۔ چنانچہ شمالی ہند کے نامور شعرا کو بھی اس کا اعتراف تھا کہ نظم کی ابتدا دکن ہی سے ہوی ہے۔ چنانچہ قائم کہتا ہے ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

اسی طرح میر صاحب فرماتے ہیں ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

ایک زمانہ تک اہل علم ولی دکنی کو اردو کا پہلا شاعر تصور کرتے تھے کیونکہ اس کے پہلے کسی کا دیوان دستیاب نہیں ہوا تھا چنانچہ مولانا محمد حسین آزاد نے ولی کو شاعری کا آدم قرار دیا تھا۔[3]

اب جدید تحقیقات اور مزید معلومات کی بنا پر سلطان محمد قلی کو پہلا شاعر قرار دیا گیا ہے جس کا کلیات ۱۰۲۵ھ کا مرتبہ ہے لیکن خود اس کلیات سے اس امر کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ یہ اردو کا بالکل ابتدائی کلام نہیں ہے

اردو کا پہلا شاعر | ہمارے نزدیک قطب شاہ پہلا شاعر نہیں بلکہ وجدی اس سے پہلا شاعر ہے گو صحیح طور پر یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وجدی کے پہلے کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا لیکن چونکہ اس کے پہلے کا کلام

---

[1] یوسف عادل شاہ کی ملکہ بوبوجی مکند راؤ مرہٹہ کی بہن تھی سلطان محمد قلی کی بیگم بھاگ متی تھی جس کے نام پر بھاگ نگر آباد ہوا تھا۔ جو بعد کو حیدر آباد کے مبارک نام سے موسوم ہوا۔ فرشتہ

[2] احمد نظام شاہ کا باپ ملک نائب نظام الملک بھری برہمنان ویجانگر سے تھا جو احمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں اپنے باپ بہرے کے ساتھ دربار شاہی میں پیش ہوا شہزادہ محمد شاہ کے ہم عمر ہونے کے باعث شہزادہ کی خدمت میں رہ کر لیاقت پیدا کی۔ ترقی کرتے کرتے ملک نائب کے درجہ پر سرفراز ہوا۔ اس کے لڑکے احمد نے خود مختار سلطنت قایم کی۔ (فرشتہ)

[3] فرشتہ [4] آب حیات۔

بطور وثوق دستیاب نہیں ہوا ہے اس لئے ابتدا کا سہرا اسی کے سر باندھا جا سکتا ہے۔

وجاہی کا نام بعض حضرات وجیہہ الدین قرار دیتے ہیں مشہور بزرگ تھے ان کی دو مثنویاں مشہور ہیں پنچھی نامہ اور تحفہ عاشقاں [2] تحفہ عاشقاں جو غالباً حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے خسرو نامہ کا ترجمہ ہے ۱۰۱۵ھ ہجری میں تصنیف ہوا ہے اور پنچھی نامہ منطق الطیر کا ترجمہ ہے جو شائع ہو چکا ہے۔

تحفہ عاشقاں میری نظر سے گذری ہے اس کا ایک نسخہ ہمارے کرم دوست مولوی ظفر یاب خاں صاحب انصاری کے پاس بھی ہے یہ ایک ضخیم مثنوی ہے اس کے متعلق کبھی تفصیل سے بحث کی جائے گی۔ کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے

کروں[1] پاک دل ہور زباں پاک سوں ثنا پاک اس عاشق پاک کوں
کہ جس سے ہوا ہے او گم عشق کا اجوں لگ ابلتا ہے خم عشق کا
پڑیا عکس اس نور کا جب رخن جھلکنے لگا آرسی کے نمن
سو اس آرسی میں کیا جیوں نظر ہوا عاشق اپنا اپس دیکھ کر
ایس کچھ، پرتو کوں معشوق جاں لیا مبتلا ہو کے عاشق کی شان
نکل گنج مخفی سے خلوت کے بہار کیا جلوہ کر کثرت بے شمار

مخفی نہ رہے کہ وجدی کی تالیف پنچھی نامہ کے متعلق بعض شکوک ہیں کیونکہ پنچھی نامہ ۱۱۵۵ھ ہجری میں تالیف ہوا ہے اور تحفہ عاشقاں ۱۰۱۵ھ ہجری میں ظاہر ہے اس قدر عرصہ تک ایک ہی شخص بقید حیات نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق دور اول میں میں نے مزید بحث کی ہے۔

سعدی | یہ بھی اسی زمانہ کا صاحب کمال اور نامور شاعر ہے افسوس ہے اس کے صرف چند شعر مشہور ہیں بعض اصحاب کا خیال ہے امیر خسرو نے اپنی ریختہ میں اسی کی نقل کی ہے۔ فارسی آمیز کلام کے باعث سب سے پہلا شاعر تصور ہو سکتا ہے

ہم[3] تمن کو دل دیا تم نے لیا ہور دکھ دیا تم یہ کیا ہم وہ کیا ایسی بھلی یہ ریت ہے
دو نین کے گھر میں بھر رہو زو نجوں لکو بہر پیش سگ کوپت مھروں پیا نجاو میت ہے
سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

---

[1] رسالہ لسان الملک جلد ۲ نمبر ۱ و ۲ از نصیر حسین خاں صاحب خیال
[2] تحفہ عاشقاں۔
[3] تذکرہ شعرائے دکن عبد الجبار خاں ملکاپوری۔

۹

قطب شاہی اردو

ہمارے بادشاہ نہ صرف حکومت و جہانبانی میں شہرہ آفاق گزرے ہیں بلکہ علم و فن کے قدردان اور خود بھی ذی علم ہوتے تھے وہ نہ صرف شعر و سخن کی قدردانی کرتے تھے بلکہ خود بھی شعر گوئی کا کافی مذاق رکھتے تھے۔

سلاطین قطب شاہیہ میں سلطان محمد قلی۔ محمد عبداللہ اور تانا شاہ ہر ایک باکمال شاعر تھا سلطان محمد قلی کا کلیات کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے جس کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب نے رسالہ "اردو"[1] میں کافی بحث کی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا یہ مضمون بہت دلچسپ ہے اس کے علاوہ سلطان محمد قلی قطب شاہ و محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کی شاعری کی کیفیت اور اُن کے کلام کے نمونے تذکرۂ شعرائے دکن مولفہ مولوی عبدالجبار خاں صاحب ملکاپوری مطبوعہ ۱۳۲۹ھ ہجری میں بھی شایع ہو چکے ہیں۔ میری نظر سے بھی یہ کلیات گزر چکا ہے جو ۱۰۲۵ھ کا مرتبہ ہے اس کو سلطان کے بھتیجے اور جانشین محمد قطب شاہ نے مرتب کیا ہے جس میں اصناف سخن سے مثنویاں۔ قصیدے۔ مرثیے۔ غزل ترجیع بند اور رباعیاں شامل ہیں۔

اس کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اگرچہ خیالات کی جدت۔ استعارات اور تشبیہات کی ندرت تخیل کی بلند پروازی تقریباً مفقود ہیں مگر آج کل کے عشقیہ کلام سے مقابلہ کیا جائے تو سوائے زبان کی شستگی اور تغیر کے کوئی فرق معلوم نہ ہوگا۔

کلام سے فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی کی آمیزش بھی بخوبی واضح ہوتی ہے۔ فارسی کے برخلاف ہندی کے موافق وہ عاشق ہے اور اس کا معشوق مرد۔

مثنویاں متعدد عنوانوں پر لکھی گئی ہیں۔ کسی میں پھلوں کا ذکر ہے تو کسی میں سبز ترکاریوں کا بیان کوئی شکاری پرندوں کا ذکر سناتی ہے تو کوئی رسم و رواج تیوہاروں اور شاہی محلوں پر لکھی گئی ہیں۔ نمونہ کے طور پر کلام پیش ہے۔

رکھ ایک ہی ہر ٹھیک کدھن لاکھ چمن ہے ۔۔۔ لکھ جوت ہے ہر ٹھار و لے ٹیکا رتن ہے
سمدور ہے ایک ہور ندیاں ہیں سو ہزاران ۔۔۔ باتاں سو کرڈراں ہیں و لے ٹھیکا رسن ہے
کس ٹھار میں دستا نہیں سب ٹھار ہے بھر پور ۔۔۔ دیکھیں کو سکت کاں لسے ہر ٹھیکا نین ہے
منج عشق گری آگ کا یک چنگی ہے سورج ۔۔۔ اُس آگ کے شعلہ کا دھواں سات گگن ہے

---

[1] رسالہ اردو جلد (۲) نمبر (۵) بابتہ ۱۳۴۴ھ

اس کے سو پرت نپت میں چل سین سوں قطبا　　تجکوں سو مددگار حسین ہور حسن ہے
پیا باج پیالا پیا جائے نا　　پیا باج یک تل جیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کور ہے　　کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند　　دوانے کو کچ پند دیا جائے نا
کفر ریت کیا ہور اسلام ریت　　ہر یک ریت میں عشق کا راز ہے
تمھارے مکھ کی کعبے کون جن طواف کرے　　نہیں ہے حاجت اسی جاد نی کون ناحجاز
محمد کی غلامی منج خطابی سر بلندی ہے　　سورج کرنا سوں باندی سایہ یاں ہم عید ہم نوروز

قصیدہ

آج شہ چین چلیا مشرق نگر تھے شتاب　　ڈھال فلک کی اچا او شہ عالی جناب
باند خنجر کرن کی زرین فرنگ ہاتھ لے　　صبح کے وقت آئیا پیک دو پیالی شراب
چرک فلک فیل مست سوں مکھ لال کر　　گرم ہو چلنے لگیا دن لے کٹک بے حساب

تشبیہات

چند ہور سکندر چلیا رین کے ظلمات میں　　شمع دیپک مشعلاں روشن ہوے اُثار
چسنج کے خم خانہ میں سو رپیا جا نو مد　　مست ہو کر پڑیا غرب کے چشمے منجھار
گگن کے مدرسے آمنے چاند مدرس کنے　　بحث کرن تارے آئے طالب علماں کے سات

رباعی ملاحظہ ہوے

مستی کے ملک میں جہانیانی منجے　　خوباں کے دیکھیں میں ہے مسلمانی منجے
خمار کا خم خانہ اہے ٹھانوں میرا　　ہدہد کا سو بندہ نگیں سلیمانی منجے

نوحہ

دو جگ اماماں دکھ تھے سب جیو کرتے زاری وائے وائے　　تن رون کی لکڑیاں جالکر کرتی ہیں خواری وائے وائے
آسمان جھج جالا ہوا سورج اگن والا ہوا　　چندر سو جل کالا ہوا ہے دکھ اپاری وائے وائے
یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پر کھینچے خنجر　　کافر کئے کیسے قہر یو زخم کاری وائے وائے
قطبا کو ہے اللہ مددوستا ہے اس دل میں خدا　　تو منج مدد حیدر دلدیریاں کو زاری وائے وائے

ظل الٰہ | سلطان محمد قلی قطب شاہ کا جانشین محمد قطب شاہ بھی شاعر تھا ظل الٰہ اس کا تخلص تھا اپنے

---

[1] سلطان محمد قلی کا کلام رسالہ اردو سے لیا گیا ہے۔

چچا کی طرح یہ بھی صاحب دیوان تھا ۱۰۳۵ھ میں انتقال ہوا نمونہ کلام درج ہے:۔

رہن باسکی من پیا باج دیکھی — ہوے تن کوں سکھ جب ملے پیو بالا

سجن نکہ شمی باج ادجالا نہ بھاوے — بھلایا ہے منج جیو کون اوا جالا

میرا دل ہے زر الفت کا کارخانہ — نہیں منجکوں بازار والا کا حاجت

بکر ید عید آیا صلوات بر محمدؐ — آنند عسلم اجایا صلوٰۃ بر محمدؐ

عشق کی تیلی ہے گوری رنگیلی — چتر نار یا نہیں دستی ہے چھبیلی

سنو لوگ میری پرم کی کہانی — کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی[1]

سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ کے بعد جس طرح اس کے بھتیجے سلطان محمدؐ قطب شاہ کا کلام موجود ہے اسی طرح محمدؐ قطب شاہ کا جانشین سلطان عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھا جس کا تخلص عبداللہ ہی تھا سلطان کی وفات ۱۰۸۳ھ میں ہوی ہے۔ ذیل کا انتخاب اسی کے کلام سے ہے۔

دلا حق کی طرف ہو کہ حق آرام دویگا — سعادت کی تری امات سر انجام دویگا

اے یار اگر ہے زندہ دل تون — یوں نام کہ جم ہو جام لیستا

معشوق وہی جو جس کی مکھ تھی — خورشید جمال دام لیستا

عبداللہ علی ولی کے صدقہ — معشوق سوں خط مدام لیستا

گفتم کہ کیست اینجا تیرا پران پیارا — گفتا کہ شاہ عبداللہ ہے میرا پرایا

خیر تو ہے جو ادھر بیٹھا ہے ادھر مو میں تو آج — دیکھ تیرا نور ہوتا ہے سر مہ جیوں طور آفتاب

روپ میرے لال کا آئے نہ تحریر میں — چاند عطارد اگر ہو ویں قلم ہور دوات[2]

عبداللہ قطب شاہ کا داماد اور جانشین ابوالحسن تانا شاہ بھی شاعر تھا جس کا ایک شعر یہ ہے

کس در کہوں جاؤں کہاں مجھ دل پہ بھل بجھرات ہے

اک بات کے ہوں گے سجن یاں جی ہی بارہ باٹ ہے[3]

صفحات گزشتہ سے نظم اردو کے موجد کا نام معلوم ہو چکا اور سلاطین قطب شاہیہ کے کلام کا اندازہ ہو گیا۔ اب اسی دور کے چند اور شعرا کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس سے اردو کے ترقی کا بین ثبوت مل سکتا ہے:۔

(۱) **نشاطی** سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا نامور باکمال شاعر نشاطی ہے اس کی مثنوی

[1 و 2] تذکرہ شعرائے دکن مولفہ مولوی عبدالجبار خاں ملکاپوری ۱۲ [3] گلشن ہند از مرزا علی لطف مطبوعہ۔

پھول بن مشہور ہے جس کا ایک قلمی نسخہ جو ۱۱۹۳ھ ہجری کا لکھا ہوا ہے کتب خانہ آصفیہ میں بھی موجود ہے یہ مثنوی اپنی خوبیوں کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے نہ صرف ادبی حیثیت سے قابل قدر ہے بلکہ معاشرت، اخلاق اور تاریخ کے لحاظ سے بھی نہایت کارآمد اور مفید ہے اس سے اس وقت کے رسم و رواج پر کافی روشنی پڑتی ہے اور پھر رزم بزم کی بولتی تصویر ہے۔

حسب عادت حمد نعت و منقبت سے ابتدا ہوئی ہے اس کے بعد سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تعریف کی گئی ہے اور اس کے بعد اصل قصہ شروع کیا گیا ہے۔ قصہ بھی نہایت دلچسپ ہے قصہ میں انسانوں کے قالب بدلنے اور جانوروں کے قالب میں جانے کا واقعہ بھی آتا ہے کوئی تعجب نہیں سر راس ورنے اس کے مطالعہ کے بعد فسانہ عجائب لکھی ہو۔ ختم قصہ کے بعد مصنف تاسف کا اظہار کرتا ہے کہ اس کے چند دوست سید محمود اور شیخ احمد وغیرہ جواس کمال کی داد دینے باقی نہیں رہے۔ بہرحال یہ مثنوی ایک اہم حیثیت رکھتی ہے اور اس پر علیحدہ پوری تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے اس کی تصنیف ۱۰۶۵ھ ہجری میں ہوئی ہے۔

اول میں حمد رب العالمین کا   دل و جاں سوں کہو جاں آفریں کا
خداوندا تجھی ہی جسم خدائی   ہمیشہ تجکوں ساجی کبریائی
ازل سوں نہیں سبج تیرا ابدایت   ابدکوں فہم نیں تیرا نہایت
کروں میں لی قلم ہات ابتدا نعت   سچیں حق کی پیمبر کا ادا نعت
محمد پیشوا ہی سروراں کی   الہی سرخیل سب پیغمبراں کی
زباں کوں ایں ادب کی سات کھولوں   نبی کی جانشیں کا مدح بولوں
علی ساری نبیاں میں ہی سپہدار   علی ساری ولیاں میں کا ہی سردار
شہاں کا شاہ عبداللہ غازی   خدائی ہی تری جم پیش بازی
سعادت کی نین کا نور ہی توں   شجاعت کی گگن کا سور ہی توں
حکوئی ہی باغباں اس پھول بن کا   چمن لاتا ہی یوں تازی سخن کا
کتی یک شہر مشرق کی کدن تھا   جواس کا ناؤں سو کنچن پٹن تھا
کنچن کا خوب اوسی جو گرد اتھا کوٹ   کنچن پوری کوں اس کہنکو ہتی کوٹ
حصار اس کا دریا کی تھا کناری   دسی خندق ہور دریا تس ہنداری
کتی کوئی بادشاہ یک اس کدہن تھا   حکومت میں سلیماں کی منن تھا

(۲) **غواصی** جہانگیر کے زمانہ میں دہلی کی سیر کیا تھا طوطی نامہ[1] اس کی تصنیف ہے۔

برس یک ہزار اور ستاویس میں — کیا ختم یہ نظم دن تیس میں[2]

(۳) **احمد جنیدی** ۱۰۶۵ھ میں انھوں نے ایک مثنوی ماہ پیکر نام لکھی تھی جس کا ایک نسخہ امپیریل لائبریری کلکتہ میں موجود ہے۔

الٰہی توں کر یو نظم جگ اجال — کہ ہووے تو جگ میں جوں محبوب شال
نبی کی سو ہجرت کا یو تھا قرار — چہار سال تین بیس بھی یک ہزار[3]

(۴) **شاہی** شاہ قلی خاں تاناشاہ کے ندیموں سے تھے مرثیے بھی کہا کرتے شمالی ہند کی بھی سیر کی تھی۔

ملنا تمھن کا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ سچ کہے — کس کس کا منہ موندوں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے[4]

(۵) **مرزا** ابوالقاسم تاناشاہ کے مصاحب اور جان نثار تھے۔

عارض نہیں چندر کا ترے گال سوں اچھا — سمجھی ہمن خلف کو نہ تجھ خال سوں اچھا
مرزا وہ نونہال کدھر مٹ گئے چمن — لگتا تھا جن کے ہاتھ پہ گل ڈال سوں اچھا[5]

(۶) **شعور** اسی عہد کا ایک باکمال تھا۔

برسات میں نہ دیکھا نظر بھر کر آفتاب — روشن یہ ہے کہ عاشق ہوا تجھ پہ آفتاب[6]

(۷) **بیچارہ** عالمگیر کے زمانہ میں دلی بھی گئے تھے۔

پی سے جدا ہونا نہ تھا چاہا خدایا یوں ہوا — جز صبر کچھ چارہ نہیں بیچارہ ہور رہنا پڑا[7]

(۸) **بحری** قاضی[8] محمود صوفی مشرف بزرگ تھے عالمگیر کے دربار میں رسائی پیدا کی تھی من لگن نام مثنوی تصنیف فرمائی تھی۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو

ہر تن کوں تلاش جوں کہ ہے تن کی — یوں من کو لگن ہے من لگن کی
بحری جو پڑا ہے غم کے یار — اے غار کے یار اُسے ہو غم خوار

حمد، نعت اور منقبت کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے روپ ترا رتی رتی ہے — پربت پربت رتی رتی ہے
اوٹ اے قلم اس گھڑی نکھر جائیں — ٹک نعت نگر کی سیر کر آئیں
ہے ناؤ احد نشان احمد — سرخی سو احد ہے پان احمد

---

[1] تذکرہ میر حسن [2] داستان اردو از رسالہ لسان الملک نواب خیال [3] ایضاً [4] تذکرہ شعرائے اردو میر حسن۔ [5] داستان اردو

مولا کے محب نبی کے نائب ۔۔۔ مانس نہیں مظہر العجائب
ساگر ہیں سپور معرفت کے ۔۔۔ بل عین ہیں نور معرفت کے

عالمگیر کی مدح میں کہتے ہیں۔

اے بول توں مدح بادشاہ کا | ہور اس کی کمالیت کلاہ کا | جس کی یو دو بال ین کی عادت | عالمگیری ہے اور عبادت
یک ملک نہیں جوان لیاین ۔۔۔ یک نقل نہیں جوان کیاین

عالمگیر کا کیرکٹر ملاحظہ ہو :- دینداردلیر ہور دانا ۔۔۔ یک علم نہ سب منے سیانا

سن الگن کی تاریخ تصنیف :- ہجری تو یہی کتاک برس تھے ۔۔۔ بارا پر ایک سو یک بہس تھے[1]
۱۲ ھ ۱۱

(۹) **طالب** مرزا طالب عالمگیر کے عہد میں موجود تھے۔

ہما کے خون چشم سے آلودہ کب کرے ۔۔۔ وہ پاک جسے گرانی ہے رنگ حناستی[2]

(۱۰) **نوری** تاناشاہ کے دربار تک رسائی کی تھی۔

نوری اپس کے دل کی کسی سے نہ کہہ تھا ۔۔۔ حاصل بھلا اب اس سے دو لنے جو تھا سو تھا[3]

(۱۱) **مومن** میاں عبدالمومن خاں حیدرآباد کے رہنے والے صاحب فن بزرگ تھے۔ اسرار عشق نام ایک کتاب سید محمد جونپوری کے سوانح میں ۱۰۹۳ھ میں لکھی ہے۔ اسرار عشق ضخیم مثنوی ہے کتب خانہ آصفیہ میں ایک نسخہ موجود ہے اور میری نظر سے گزرا ہے ذیل کا انتخاب اسی سے ماخوذ ہے۔

عجب دی شب کہ منجن سیم کر حل ۔۔۔ عروس بدر سر تمنا نور کی جل
منجی خانی تھی مشرق کی نکل ابھار ۔۔۔ بیٹھی آ تخت پر سنگم کی اظہار
تجمل کا دکھانے جب نبی کوں ۔۔۔ چوا چو کی کیتی لالی نکت سوں
کرتا جا تجملہ مغرب منی چل ۔۔۔ سور جگی شو سوں دی جلوا لکی کل
پرت کی ریت میں بھی خوب لاگی ۔۔۔ عروس آپیں ہو جانا شو کی جاگی

ولایت کی جلالت کا سمج راز ۔۔۔ ہوا ہر سور تھا سمج آتش انداز
اکن سوں کھیلے تھی سخت شیراں ۔۔۔ بھتر پر سپر نکلتی تھے دلیراں
لے سید محمد سوں سبرن بھاگ ۔۔۔ کیسی ہسر تنہ تھی صورت صراگ
کھو میتے تھی اکن میں تیر بازی ۔۔۔ دکھائی تھی فلک کو تیغ بازی
سمنداہ کا بلی صرصر پچی تھی ۔۔۔ کبھی نکری کی بجلیاں کی پچی تھی
یوں ہور برق ملدی اگ کون ناد ۔۔۔ جلالت کا دکھا رہی سور کی بھاؤ

اری توں ازل سوں شاہ کا جام ۔۔۔ کیا تیری طلب کا خوش سرانجام
آتا کر رقص الت تازہ بنا تا ۔۔۔ تنن ناتن ناتن متنا نا[4]

---

[1] از رسالہ لسان الملک مضمون خیال [2] ل [3] تذکرہ میر حسن [4] اسرار عشق قلمی ۱۲

۱۵

اُردو نثر کی ابتدا

اُردو نظم کی ابتدا کی بحث تو ہو چکی اب اُردو نثر کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے مولانا آزاد نے آب حیات میں تصریح کی ہے کہ محمد شاہ کے عہد ۱۱۴۵ھ ہجری میں ایک بزرگ تھے جن کا تخلص فضلی تھا۔ دہ مجلس نام ایک کتاب لکھی تھی غالباً یہی اردو کی پہلی تصنیف ہو گی پھر آگے چل کر مولانا نے لکھا ہے کہ :۔

"بہر حال اس وقت تک انشا پردازی اور ترقی زبان اردو کی فقط شعراء کی زبان پر تھی۔ جنکی تصنیفات غزلیں عاشقانہ اور مدحیہ قصیدے ہوتے تھے اور ان سے غرض امرا و اہل دول سے انعام کا تھا نثر کے حال پر کسی کو توجہ نہ تھی ۱۲۱۳ھ ہجری میں میر محمد عطا حسین خاں نے چار درویش کا قصہ اُردو میں لکھا تھا ادھر یہ حال تھا کہ چونچال لڑکا شعرا کے جلسوں اور امرا کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا ادھر دانائے فرنگ نے کلکتہ میں اس کے پرورش کی جانب توجہ کی۔ چنانچہ ۱۲۱۴ھ ہجری سے ۱۲۲۳ھ ہجری تک باغ اردو۔ آرایش محفل۔ قواعد اردو (جان گلگرسٹ) ترجمہ اخلاق محسنی۔ پریم ساگر لکھی گئیں۔ اسی زمانہ یعنی ۱۲۲۲ھ ہجری میں مولانا شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ کیا اس کے بعد مولانا اسمٰعیل نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمایش کے لئے اردو میں لکھیں[1]"

مولانا نے یہ جو کچھ لکھا وہ اس وقت کی معلومات کے لحاظ سے لکھا تھا جس طرح ولی کے بہت پہلے شاعری کا وجود اور کلیات اور دیوان دستیاب ہو کر مولانا کی تحقیق کو غلط ثابت کر چکے ہیں اسی طرح ایک صدی پہلے کی نثر کا پتہ چل چکا ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ سلاطین قطب شاہ علم و ہنر کی ترویج میں ہمیشہ کوشاں رہا کرتے تھے جس کے باعث علوم کی بے شمار کتابیں ان کی عہد میں مرتب ہوئیں اور اردو نثر و نظم کو کافی ترقی و وسعت حاصل ہوی چنانچہ عہد قطب شاہی کی ایک کتاب احکام الصلوٰۃ ہے یہ ایک رسالہ ہے جو چھوٹی تقطیع پر خط نسخ میں لکھا ہوا ہے اس کے مصنف مولانا عبد اللہ ہیں۔ جنھوں نے ۱۰۳۲ھ ہجری میں اس کو مرتب کیا ہے اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے نماز کے متعلقات بیان کئے گئے ہیں بلکہ اس کو مختصر فقہ حنفی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ معلوم ہوتا ہے مصنف نے اس کو فارسی سے ترجمہ کیا ہے نمونہ کی عبارت حسب ذیل ہے :۔

"اول کلمہ طیب۔ پہلا کلمہ بولتا ہوں میں پاکی کا کہ اسکی پاکی ایمان کی کفر تی۔ شرکتی

---

[1] آب حیات

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ نہیں کوئی معبود برحق اِلّا اللّٰہ مگر اللہ تعالیٰ معبود برحق ہے۔ مُحَمَّدٌ
رَّسُوْلُ اللّٰہِ محمدؐ رسول خدا کے برحق ہے۔ دوم کلمہ شہادت دوسرا کلمہ بولتا
ہوں میں شہادت کا یعنی گواہی دیتا ہوں اُس خدائے تعالیٰ کی یک پنی پہ۔ اشہد ہو
گواہی دیتا ہوں میں ان لا الٰہ کہ نہیں کوئی معبود برحق"

"بات کرنے سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں آدمیاں کی مثال دُعا منگتے نماز جاتا ہے۔
ہی واہ کہنے سوں نماز جاتا ہے۔ درد سوں یا مصیبت سوں نماز جاتا ہے۔ رونے
سوں یا دنیا نکی سبب سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں کسی موت کی خبر سنکر قالوا انا للّٰہ
وانا الیہ راجعون۔ بولتی سوں نماز جاتا ہے۔ خبر عجب سنکر نماز جاتا ہے۔ نماز میں
سبحان اللّٰہ بولتی سوں نماز جاتا ہے مصحف دیک کر پڑنیسوں نماز جاتا ہے۔ نماز
میں قہقہہ ہنسنے سوں نماز جاتا ہے۔"

روح قبض ہوا اسی وقت اسکیا ن انکھیان موچنا ہور۔ پاؤں دراز کرنا ہور ہات دراز
کرنا دونو پہلو کے طرف ولیکن سینے پر نا رکھنا ہور اسی کی تھوڈی ہور سر کوں ملا کر بندنا
اسے تیر نخداں بولتے ہیں یو سب سنت ہے ہور مرنی تے اول اس کی سر کوں قطب کے
طرف کرنا سلانا ہور موئے بعد از اسی غسل دینا اس طریق سوں"۔

ایک اور کتاب مفتاح الخیرات نام ہے جس کے مصنف کا نام یا سنہ تالیف معلوم نہ ہو سکا مگر
یہ کتاب بھی نسخ میں لکھی ہوی ہے چونکہ عہد قطب شاہ و عادل شاہ کی ابتدائی کتابیں عموماً اسی خط
میں لکھی ہوی ہیں اس لئے گمان غالب ہے کہ یہ بھی اسی دور کی لکھی ہوی ہے اس کتاب میں بھی
یائے معروف و یائے مجہول کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے اور نہ تذکیر و تانیث کا۔ نمونہ درج ہے:۔

"ایمان کی حکمان کا معرفت ہور نماز احکام ہور ارکان پچھانا تمام مسلمان پر فرض ہے
کہ سب کوں اسکی پچھان تی چھٹکارا ہے ہور۔ آخرت میں خدا کے عذابوں گرفتار
نا ہویگا۔ اگر تجھے پوچھیں کے ایمان کیا ہے بول تو ایمان اقرار کرنا ہے زبان سے
یقین ہور استوار کرنا ہے دل میں خدائے تعالیٰ یک ہے بقراس یک خدا خارج دوسرا
نہیں ہے ہور جو کچھ کی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدائے تعالیٰ کے نزدیک
تھیں لے کر آئے ہیں سو حق ہے راست ہے ہور فرشتے ہور آدمیاں پریان یو
سب خدا تعالیٰ پیدا کیا۔ اگر تجھے پوچھیں ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے۔

> بعضی بولتے ہیں کہ ایمان غیر مخلوق ہے اور بعضی بول تے ہیں مخلوق ہے دو روشن پہ ہے
> اول ایمان اقرار کرنا ہور استوار کہنا یو فعل بندیکا ہے "[1]

قطب شاہی دور کی نثر کی ایک دوسری کتاب سب رس ہے جس کو ملا وجہی نے غالباً حضرت وجیہہ الدین گجراتی متوفی ۹۹۸ھ کی تالیف سے ترجمہ کیا ہے اس کتاب کے تین نسخے میری نظر سے گزرے ہیں ملا وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کے عہد ۱۰۴۵ھ میں اس کو مرتب کیا ہے یہ تصوف کی ایک بہترین کتاب ہے جس کو فرضی قصہ کے طور پر لکھا ہے مگر جا بجا مختلف عنوانات مثلاً ذکر لا الہ۔ معراج عشق بندگی اطاعت مادر و پدر۔ صبر و شکر عنوانات پر کافی بحث کی ہے۔ انسانی جذبات کی حقیقت اور کش مکش کو جس خوبی سے فسانہ کی صورت میں پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ عقل۔ دل عشق حسن۔ وفا۔ مہر۔ عمزہ۔ ناز۔ نظر۔ خیال۔ عافیت ہمت۔ دیدار وغیرہ نام دئے ہیں۔ بہر حال یہ کتاب نہ صرف تصوف کے لحاظ سے قابل تعریف ہے بلکہ ادبی حیثیت سے بھی نایاب ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نہایت مقبول تھی۔ کیونکہ ایک صدی سے زیادہ تک اس کے نسخے مرتب ہوتے رہے ہیں۔

میری نظر سے جو تین نسخے گزرے ہیں ان میں سے ایک جو ۱۲۱۴ھ ہجری کی لکھی ہوی ہے مولوی آقا حیدر حسن صاحب کے پاس ہے اور دو کتب خانہ آصفیہ میں ہیں ایک ۱۲۹۵ھ کی لکھی ہوی ہے دوسری نامکمل ہے جو اس سے قدیم ہے۔ حال میں رسالہ اردو میں مولوی عبدالحق صاحب نے اس کے متعلق ایک دلچسپ مضمون شایع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف کے پاس دو نسخے ہیں جو ۱۱۷۱ھ و ۱۱۸۰ھ کے لکھے ہوے ہیں۔ رسالہ اردو میں جو مضمون شایع ہوا ہے اس میں مولوی عبدالحق صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ باوجود مکمل دو نسخے پیش نظر ہونے کے تاریخ تصنیف معلوم نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ خاتمہ کے کچھ پہلے جس کا نمونہ مولوی صاحب نے بھی دیا ہے سنہ تصنیف موجود ہے۔

کتاب کی عبارت مقفیٰ ہے۔ کوئی تعجب نہیں مرزا رجب علی سرور نے اپنی تصنیف فسانہ عجائب اسی کو دیکھ کر کی ہو۔ مختلف مقامات سے نمونہ پیش ہے:۔

> تمام مصحف کا معنا الحمد للہ میں ہے مستقیم۔ ہور تمام الحمد للہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم۔ ہور تمام بسم اللہ کا بسم اللہ کی نقطی میں رکھیا ہے کریم۔ سمجھ دیکھ خاطر آتال

---

[1] مشکوٰۃ نبوت قلمی مصنف حضرت علی الموسی ابن موسیٰ قادری رحمتہ اللہ علیہ

حدیث میں یوں آئی ہی کہ العلم نقطہ وکثرہا الجہال۔ یعنی علم ایک نقطہ ہی جاہلاں نے اسے بدلائے۔"

"سلطان عبداللہ ظل اللہ عالم پناہ صاحب سپاہ حقیقت آگاہ دشمن پرور ثانی سکندر عاشق صاحب نظر دل کی خبرنی باخبر۔ صورت میں یوسف تی اگلی ادمنے ہوش پہنر بکلیے۔ حکمت میں فلاطون شاگرد۔ سخاوت میں حاتم کا کھوسے پر دا شجاعت میں رستم کرد۔ عالی ہمت غازی مرد۔"

"عشق خدا کون بھید یا تو اس کی خاطر آسمان زمین ہویدا کیا۔ عشق خدا کون بھیدیا تو اپنا حبیب کر محمدؐ کوں پیدا کیا اگر محمدؐ نا ہوتا تو آسمان زمین نا ہوتا اگر محمدؐ نا ہوتا تو ماہ پیروین نا ہوتا اگر محمدؐ نا ہوتا تو دنیا ہور دین نا ہوتا۔ صاحب طٰہٰ ویٰسین صاحب رحمۃ للعالمین جس کے نور تے عالم نے پایا روشنی لولاک لما خلقت الافلاک کا دھنی۔"

"آغاز داستان زبان ہندوستان۔ نقل ایک شہر تھا اس شہر کا ناؤں سیستان۔ اوس سیستان کے بادشاہ کا ناؤں عقل۔ دین و دنیا کا کام استے چلتا اس کے حکم باج ذرا کیں نہیں ہلتا اس حکم پر چلتا اس کی فرمودی پر چلی حور دو جہاں میں ہوی بھلی دنیا میں خوب کنوائی۔ چار لوکاں ہیں عزت پائی جان رہی کہری وان قبول پڑی۔ نہ آفت دیکھی نہ زلزلا۔ اپی بھلے تو عالم بھلا۔ کسے کوں برا بولنا یو وسواس ہی۔ بھلائی برائی سب اپنے پاس ہی اپے چل نہیں جانتی دوسریاں پر برا مانتے اول اپنی خبر میں اپی رہنا پچھن دوسرے کوں برا کہنا۔ جنی آپس کون پچھانا انے سب جانیا جدھر ڈھلنا ہے اودھر عقل کے اجالی میں چلنا ہے۔"

"اس فرزنداں میں کا بڑا فرزند سو یو کتاب لایق مستند ہر باب اپنے وقت کا لقمان افلاطون اپنے وقت کا خسرو فرہاد مجنوں اپنے وقت کا خاقانی انوری سعدی اپنے وقت کا ظہیر سلیمان اپنے وقت کا ہر ایک بات کا ہادی۔"

"صحبت اس کی سب کو بھاوے بات اس کی جوں شکر جوں نبات جو لکن دینا تو لکن اسے حیات پائے جس وقت تھا یکہزار چہل وپنج اس وقت ظہور پکڑیا یو چھا کنج جو کوئی صاحب سخن اچھیکا جو کوئی صاحب فن اچھیکا اسے یو سخن اثر کریکا مست بی خبر کریکا۔"

"پتوں بادشاہ ھور بادشاہ کے دوستاں بادشاہ کے عزیزاں بادشاہ کے خویشاں قرابتیاں بادشاہ کے پیاریاں پیارے مانتے منگتہارے بادشاہ کے خدمت گاراں دولت خواہاں دعاگویاں امیدواراں سب اپنی مراد کو اپنیر دانوکوں غیب کی نعمت نپیرو رزق فراخ اچھو۔ ہمیشہ بعیش و عشرت اچھو دائم بدولت اچھو عافیت بخیر اچھو ایمان سلامت اچھو آمین یارب العالمین۔"

شمائل الاتقیا یہ کتاب تصوف میں برہان الدین اولیا اورنگ آباد کی لکھی ہوی ہی اس کا ترجمہ اسی نام سے میراں یعقوب نے کیا ہے جو ۱۰۸۷ھ میں مرتب ہوا ہے یکم ربیع الثانی ۱۲۹۳ھ کا لکھا ہوا نسخہ میری نظر سے گزرا ہے [1]

کتاب ضخیم ہے نفس مضمون کے پہلے ایک طویل فہرست ان کتابوں کی دی گئی ہے جس سے اس کتاب کو مرتب کیا گیا ہے جن میں تفسیر کی پندرہ (۱۵) حدیث کی نو (۹) فقہ کی تین (۳) اور دیگر کتابوں کے سو سے زیادہ نام درج ہیں یہ کتاب جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تصوف میں لکھی گئی ہے اس کو چار قسم اور نوے بیان میں تقسیم کیا ہے توبہ۔ عمل حمیدہ۔ ہدایت و ارشاد۔ معجزہ و کرامت۔ حکمت۔ بیعت۔ در حکم مرید۔ آداب مرید۔ حکم نماز۔ علماء نیک۔ استقامت وغیرہ عنوانات قائم کئے ہیں۔ مختلف مقامات سے نمونہ پیش ہے۔

"اپنی حیات کی وقت منجے اشارت کئے تھی جوں شمائل الاتقیا کتاب کوں ہندی زبان میں لیاوی تا ہر کسی کوں سمجھا جاوی اس وقت منجے بیا نہیں تا کہ یک ہزار ستر پر اٹھول سال کوں رحلت کئے پران ان کے بھانجے عارف حق رسیدی عارفوریکی نور دیدی مصطفے کی کلیجی ھور اور مرتضی کے مین شاہ میراں ابن سید حسین سلمہ اللہ تعالی کی خلافت کے زماں نے میں کتاب لکھنے کا شروع کیا جی کچھ مشکل آتا تھا سو پیر کی مدد سوں اسان لکھا جاتا تھا جب خدا کی توفیق سوں کتاب تمام ھوا ھور حضرت شاہ کی حضور ھور محقق کامل موحد واصل شریعت کے موافق بابا ابراہیم خلیل کے اس کی لیکر مطالع فرما کر خوش کئے"

حمد و ثنا واصفیا کی کناں ھور خصلتاں کی من بیحد و بی پایاں ھور سرانا ھور بکھاننا اولیا ھور انبیا کیاں نیکیاں ھور اس کے صفتاں کے بہانت بی گنت ھور بے انت اس پاک ذات کوں واجب ھور سزاوار ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

"۔۔۔۔۔۔۔ شیخ احمد عربی فرماتے ہیں کہ پیر خدا بخشش ھور مردانہ ھونا جو خدا باج کیسے

---

[1] کتب خانہ آصفیہ میں قلمی نسخہ موجود ہے۔

چنیر طرف مون نہ پھرادی هور سب موجودات کوں معدوم کرجیانے یعنی جیکچہ چنیر او تو عالم ہی سو سمجھ کر پو چپ هور بہوت اونچی همتکا هونا جو دین هور دنیا کے تمام قرب هور مراداں اگر اوسے دیوی تو اس طرف رجعی نا کرے تو مازاغ البصر وما طغیٰ کے صفتاں وی هور ہمیشہ ظاهر کا تجرید هور باطن کا تفرید اچھی هور بہوت باربردار اچھی جو خدا کے بندی اهیتی بچپ کر کنارہ ہی نا هویں اگر کسی مرید تھی کچھ سہو هور خطا هو کراوی تو عفو کری هور نصیحت"

معجزہ اور کرامت کے ذکر میں اس طرح بیان کیا ہے :-

"هور ولیاں کوں کرامت ہی کہ انیو پورا علم دهرتے ہیں ولے مغلوب هور بیخود ہیں جیکچہ انیو تھی ظاهر ہوتا ہی سو اسے کرامت کہتے ہیں اما معونت او هی جو بعضے دیوانے جو پورا علم و معرفت نہیں دهرتے ہیں انو تھی کچھ خرق عادت یعنی کدهن نہیں ہوتا ہی سو چنیر ظاهر ہوتا ہی هور استدراج اسے کہتے ہیں جو بعضے بے ایمان لوگاں کچھ سحر هور منتر هور اسم زان کے چنیر اظاهر کرتے ہیں"

یو تمام اسرار رموزاں عالم جبروت کے کہاں سمجھ سکتے ہے لوگاں ناسونکے

یو سمجنا راز و رموز ہے کار خاصوں کا جنو پائی ہے حق کرم نے مرینی لاهوتکے

مثنوی روح افزا اس نام کی ایک مثنوی ۱۰۹۴ھ میں لکھی گئی ہے جسمیں ایک قصہ نظم کیا گیا ہے ہیرو کا نام رضوان شاہ ہے کتاب حسب معمول حمد و نعت و منقبت سے شروع کیگئی ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں قلمی نسخہ موجود ہے مگر افسوس مصنف کا نام معلوم نہو سکا

رکھیا استاداں پرانی اُسی — هور ادب سیکھ لائی اسی — ہر یک علم واقف ہو پڑا کتاب — اسے خوشنو سے بھی آئی شتاب

ہوا زور کشتے میں ملی ہی — سکیا تیر تیزی کری سب ہنر

چڑیا باپ کا تخت رضوان شاہ — جمع هور وزیراں بھی ساری سپاہ — کبت تک کو دی انعام کنیا نہاں — کسے مال دتیا کسی گوش مال

قدیمی وزیراں کو عزت دیا — انو جیوں نصیحت کئی تیوں کیا

وساعت بہت سعد تھی ظاہرہ — کری کر شفقت پیا وساحرہ — سنے جب منوچہر کی سب خبر — سو شیشے کو لی سات آئی اتر

چلی ہات سوں میمونہ کو سات لے — الس ہات میں الس کرامات لے

خاتمہ پر کہتا ہے کہ :-

کروں کیوں شکر اسکی اتمام پر — ہزاراں شکر ہی یو انعام پر — اتھا جس وقت سال ہجر تہاں ہزار — اس او پر نود اس کی اوپر چہار

ہوا قصہ رضوان شہ کا تمام — بینے هور ولی پر ہزاراں سلام — ہزاراں ہر ددو ہزاراں سلام — زماں بر محمد علیہ السلام

قطب شاہی دور کے نظم و نثر کا نمونہ پیش کر دیا گیا جس سے اس وقت کی زبان کا کافی اندازہ ہو سکتا ہی۔ انکے دیکھنے تو معلوم ہو سکتا ہی اس وقت تذکیر و تانیث کا لحاظ نہ تھا یاے معروف و مجہول کا فرق نہ تھا اور کے بجائے هور۔ سے کے بجائے سوں۔ منہ کے بجائے مکھ۔ کو کے بجائے کوں وغیرہ الفاظ استعمال کئے جاتے تھے اور عموماً نسخ میں کتابیں لکھی جاتی تھیں اسکے بعد بیجاپور کی اردو کی جانب توجہ کیجاتی ہی گو وہ بھی تقریباً ایسا ہی نا ہی لیکن سہولت کیلئے علیحدہ بیان ہی مناسب خیال کیا گیا۔

۲۱

عادل شاہی اردو

اب اسی زمانہ میں بیجاپور کی اردو پر نظر کرنی چاہیئے۔ سلاطین قطب شاہی کی طرح سلاطین عادل شاہی بھی علم و فن کی سرپرستی میں سر آمد روزگار تھے اچھے اچھے باکمال اُن کے دامن دولت سے وابستہ اور اُن کے چشمہ فیض سے سیراب ہوتے تھے۔ اُن کے دربار میں شاعروں اور ادیبوں کا جمگھٹا تھا اُن کا آستان اہل علم و فن کا ملجا و ماوا تھا۔

نصرتی علی عادل شاہ سلاطین عادل شاہیہ سے ایک نامور اور علم دوست بادشاہ تھا جس کے دربار کے کئی ایک باکمال آسمان شہرت پر چمکتے تھے منجملہ اُن کے ایک نصرتی ہے جو ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز اور صاحب شوکت شاعر تھا۔

محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص تھا۔ گلشن عشق[۱] اور علی نامہ جیسی مثنویاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ علی نامہ علی عادل شاہ کی لائف ہے جو ۱۰۷۶ھ میں لکھی گئی اور گلشن عشق ۱۰۶۸ھ میں ترتیب دی گئی ہے۔ اس میں منوہر اور مدمالتی کے حسن و عشق کے قصہ کو نظم کا جامہ پہنایا ہے یہ مثنوی اپنی رنگینی تشبیہوں اور استعارات کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔ گلشن عشق کے اشعار بعض تو نہایت صاف ہیں اور بعض نہایت ادق۔ کہیں عربی و فارسی کی آمیزش نظر آتی ہے تو کہیں بھاشا کی بہتات ہے حسب رواج مروجہ حمد و نعت سے ابتدا ہوی ہے کہتا ہے ۔

عنایت کا تجھ ہت ہے عالم نواز | کوئی ذرہ خورشید تھی سرفراز
دو عالم کوں سو جانوں لک بات میں | دیکھنا چھپا یا پی تجہ ہات میں
دیا ہے توں خاکی کوں ایسا شرف | جو تس سجدہ توری کہی صف لصف

نعت میں کہتا ہے ۔

یو نعت سرور عالم محمد مصطفےٰ کا ہے | کھلایا گلشن ہستی اول جس نور کا پانی

بادشاہ کی مدح میں کہتا ہے ۔

خصوصاً شہنشاہ عادل علیؓ | ترا ناؤں کاری جو ہے است بلی
فضیلت میں تجھ آج ہے بے خطا | کہ علم لدنی تجھے ہے عطا
توں دانش سوں سب کھبول نہ محفوظ پاچھے | ترا مدرسہ لوح محفوظ اچھے

---

[۱] گلشن عشق کتب خانہ آصفیہ میں اور علی نامہ بقول مولف تذکرہ شعرائے دکن نواب عماد الملک کے کتب خانہ میں موجود ہیں گلشن عشق میری نظر سے گزری ہے

اس کے بعد عقل اور پھر عشق کی تعریف میں چند صفحے کہے ہیں چنانچہ کہتا ہے :-

اچھی عقل یک دولت ناپدید — اچھی عقل مشکل کے جال کی کلید
اچھی عشق خلقت کی جگ کا سبب — اچھی عشق گنجینۂ راز رب

اصل قصہ کا بیان ملاحظہ ہو :-

نول لنکوں دیس ماہ جگ میں سعید — اتھا مجھ فرخندہ روز عید
شرف دار دیس تج سورج نی ایار — خوشی کا کر جگ پہ تھا نو بہار
سبھی صبح کا دیکھتی مکھ بہاں — نول عیش پائی لکیا پی کر اس
عجب حق کی تقدیر کا کام ہے — نہ کس پہ عیاں تس کی انجام ہے
بھلا ہے اس تج سہنا بھلا — خوشی دی چھپن کر اول نیلا
کھنا ریوں قصۂ دلپذیر — کبھی کھول کر بات یوں بی نظیر
کہ یک روز دو خسرو نیک فن — سخاوت بھی بھرا کہ دو الم تن
سو کھ بات دھونی نی فارغ ہو سب — کیا اپنی رانی تی پوچھیں طلب
دنب تار کوں دل کی جھو کی یہ لال — دھوی حشرت کا ان بھوجن کا تھال
شبیا بات جیوں شاہ نعمت کی دھیر — پکاریا جھی نل تلاش یک فقیر

خاتمہ پر کہتا ہے :-

ہر یک داستاں بوستاں دل کی زین — ہر یک بیت ہر یک محل جانشین
صفائی کی صورت کی ہے آرسی — دکھنی کا کیا شعر ہوں فارسی
فصاحت میں کر فارسیاں کا کلام — دھری مغز ہندی بچن پہ مدام
ذکر شعر ہندی کی بعضی ہنر — تسکیں ہر لیا فارسی میں سنور
تلک جگ میں مقبول اچھو یوں مدام — بحق محمد علیہ السلام [1]

گلشن عشق کی تاریخ تصنیف :-

کہا اس کی تاریخ یو ہجرتی — مبارک یو ہے ہدیہ نصرتی
(۱۰۶۸ھ)

علی نامہ کا نمونہ بھی ملاحظہ کے قابل ہے :-

سرا ناسری اس سکت دار کوں — کہ ادھار ہے ان نزاد ہار کوں

۱؎ از گلشن عشق۔

دیا دور رستم کے خنجر میں زور ۔۔۔ پڑیا ڈرتی جس دل میں دریا رشور

زہے بیٹے لامکان کا دلیر ۔۔۔ علی ولی او خدا کا شیر

تو ایک کوٹ ہے برج جس کے تمام ۔۔۔ او بارا اماماں علیہ السلام

لکھوں نیا مدح شاہ زماں ۔۔۔ کہ ثانی سکندر صاحبقراں

قلم آج جو مجھ جہانگیر ہے ۔۔۔ صفت شہ کی لکھنے کی تاثیر ہے

زہے شاہ عادل سمی ولی ۔۔۔ علی بن سلطان محمد بلی

ایک فتح کی تاریخ کہتا ہے :-

وہیں تو فتح کی تاریخ نصرتی بولیا ۔۔۔ علی نے پل میں نیا لائے صلابت سول ۱۰۸۵ھ

طمع کی مذمت یوں بیان کرتا ہے :-

طمع اہل عزت کو کرتی ہے خوار ۔۔۔ کرے جگ میں بے قول و بے اعتبار

طمع نام و ناموس کا کال ہے ۔۔۔ طمع جیوں کو سکہ کے بھونجال ہے

خواجہ بندہ نواز رح کی مدح کرتا ہے :-

جسے ناوں عالم میں بندہ نواز ۔۔۔ محمد حسینی ہے گیسو دراز [۱]

ہاشمی نصرتی کا ہمعصر دوسرا مشہور شاعر ہاشمی ہے جو مادرزاد اندھا تھا۔ ریختی کا یہی موجد ہے۔ یوسف زلیخا نام ایک مثنوی اس نے لکھی تھی ۱۰۹۸ھ میں انتقال ہوا۔ مثنوی میری نظر سے گزری ہے نمونہ ملاحظہ ہو [۲]

دیا عشق ہر یک شئی منئ تو میں لگن نامہ لکھا ۔۔۔ سن عشق بازاں سوں سگل لا ذکر جو اک بار کا

ثنا حمد اس کو سزاوار ہے ۔۔۔ سگل عشق کا جس کو بستار ہے

سکت کس میں ہے جو کرے سربسر ۔۔۔ ابتدا ہاشمی تو مناجات کر

مرے شعر کرے بادشاہاں پسند ۔۔۔ پسند کر کر دراکیں جو سب ہوشمند

میرے شعر میں دی شجاعت کا بل ۔۔۔ جو خوش ہوے سنکر دلیراں سگل [۳]

اگر کوئی آکے دیکھے گا تو دل میں کیا کہے گا ۔۔۔ مجھے بدنام کیا کرتے کہیں میں جاونگی چھوڑ و

رضا گر مجھ کو دیتے ہی کرونگی گھر میں جا دارو ۔۔۔ اگر مجہ ہو وینگی فرصت صبح پھر آونگی چھوڑو [۴]

ان کے علاوہ اور بھی صاحب کمال مشہور تھے جو اپنے وقت کے استاد فن تسلیم کئے جاتے تھے۔ بیجاپور ہی میں پہلے پہل مرثیوں کی ابتدا ہوی جن کی ابتدا کا سہرا شجاع الدین نوری کے سر ہے اس کے متعلق میں نے علیحدہ تفصیل سے بحث کی ہے۔

---

[۱] از تذکرہ شعراء دکن مولفہ عبدالجبار خاں ملکاپوری [۲] از مثنوی یوسف زلیخا [۳] تذکرہ شعراء دکن عبدالجبار خاں آصفی [۴] کلیات الملک نواب جمال

دکن میں مرثیوں کی ابتدا

عرب کی شاعری میں مرثیہ کا خاص درجہ رہا ہے جو اپنے سوز و گداز اور پر اثر ہونے کے باعث دلوں میں ولولہ جوش اور انتقام کی آگ روشن کر دیتا تھا۔ عرب کی فطرت بھی اس کی موید تھی۔ زمانۂ جہالت کے قطع نظر زمانہ اسلام میں بھی اس کا رواج رہا ہے مگر یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ اسلام کے سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ باعث غم والم واقعہ یعنی شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعلق ایک بھی مرثیہ عربی میں نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ ذاتی اور سیاسی اغراض کے مدنظر بزور شمشیر ظلم و ستم سے اس کی ممانعت کی گئی۔ صدیوں بعد محقق طوسی کے اثر سے عراق عرب اور ایران میں کچھ دنوں تک یہ غم تازہ رہا مگر ایران کے انقلاب نے اسے بھی صدمہ پہنچایا جو آخر صفویوں کے زمانہ سے قبل اس غم کو استحکام نہ ہو سکا۔

شمالی ہند میں ہمایوں کے دوبارہ واپس ہند آنے کے پیشتر مجالس عزا کا دستور نہ تھا مگر اس کے کم و بیش نصف صدی پہلے دکن میں ان کا رواج ہو چلا تھا۔ دکن کی خود مختار سلطنتوں میں جو علم و فن کی ترقی میں ایک دوسرے پر سبقت لیجایا کرتی تھیں مجالس میلاد اور مجالس عزا کا بھی خاص دستور ہو گیا تھا اس کی ابتدا کا سہرا بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کو ہے۔ بیجاپور کے عادل شاہوں کے بعد نظام شاہوں اور قطب شاہوں میں بھی اس کا رواج ہو چکا تھا۔ جس طرح دہلی میں دکھنی شہزادوں اور امیروں کی بدولت اردو کا نام نکلا اسی طرح انھیں دکھنیوں کی وجہ سے وہاں مجالس عزا کا دستور ہوا۔

ابتداً یہاں فارسی شعرا کا کلام خصوصاً محتشم کاشی کے بند پڑھے جاتے تھے مگر "دکھنی" زبان عام طور پر مروج ہو چکی تھی اور فارسی گویا رخصت ہو چکی تھی اس لحاظ سے مرثیوں کا اس زبان میں ادا ہونا ناگزیر تھا چنانچہ ایک خاص گروہ مرثیہ گویوں کا پیدا ہو گیا۔ ان مرثیہ نویسوں میں سب سے پہلے شیخ شجاع الدین نوری کا نام پیش ہوگا۔

نوری بیجاپوری علم و فن کا شایق شعر و سخن کا دلدادہ تھا۔ علم کا شوق آگرے تک لے گیا۔ ایک زمانہ تک ابوالفضل اور فیضی کا ساتھ رہا۔ غرض نوری نے مرثیہ گوئی کا ایک مکتب کھول دیا۔ نوری کے کلام کا نمونہ پیش ہے۔

کوئی نظر اس میں تو کرتا نہ تھا   ولے سب تعصب دیا ہم مٹا

اشہ از رسالہ لسان الملک مضمون نواب خیال۔

نہ کچھ خوف کھایا نہ جھجکا ذرا   وہیں مرثیے سے بہل کر دیا
شروع میں کیا نظم کل واقعا   وہیں تک احوال پورا لکھا
میں جب اس کو لوگوں کے آگے پڑھا   عجب حال عاشور خانہ میں تھا
جن و انس کرتے تھے سب واہ وا   کہ دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیا
زباں اپنی میں کس نے ایسا لکھا   کبھی اس سے پہلے سنانے پڑھا
اماں سے اس کا ملے گا صلہ   کہ ہے نوری ہی موجد تو اس طرز کا[1]

نوری بیجاپوری کے بعد ہاشم علی برہان پوری کا نام نظر آتا ہے جس کا یہ قطعہ مشہور ہے۔

کوی نہ تھا بیگانہ نہ از بند و خطا   ظلم تھا سب خویش سب اقوام کا
ختم ہے یو امتحان و بلا   ختم ہے جو حق سیس پیغام کا
تھا بر اولاد شفیع المذنبین   ظلم بے حد در جہاں اقسام کا
زخم لاگا مرتضیٰ کے سر اُپر   گر پڑا جوں آفتاب اس بام کا
زہر دے مارے حسنؑ کو مکر سے   سبز تھا وہ چہرہ گلفام کا
کربلا میں تھا حسین ابن علیؑ   آج غم ہے گا انھیں ایام کا[2]

کاظم علی[3] بھی مرثیہ گوئی میں شہرہ آفاق ہوے۔ عہد قطب شاہ کے یادگار ہیں کہتے ہیں۔

اے نابکاراں[4] دین کا چھتر گرانا کہاں روا   سرور نبی کی آل کوں یو دکھ میں نہالیا کہاں روا

قطب شاہی کے دور کے دو اور مرثیہ گو بھی قابل ذکر ہیں جن میں ایک راہم[5] راو ہیں جو شاہی امرا میں داخل تھے۔ دوسرے سیوا[6] جنھوں نے ۱۰۹۸ھ میں روضۃ الشہدا اور قانون اسلام کی سی دو کتابیں لکھیں اس کے بعد بھی اس کا رواج رہا۔ نظم و نثر میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ چنانچہ ۱۱۴۵ ہجری میں شاہ فضل اللہ فضلی نے دہ مجلس نام ایک کتاب نثر میں واقعات شہادت کے متعلق لکھی جس کو مولانا آزاد نے نثر کی پہلی کتاب قرار دیا ہے نمونہ درج ہے۔

"اس کتاب کا سبب تالیف یہ تھا کہ قبلہ حقیقی اور کعبہ تحقیقی میرے نواب شرف علی خاں ہر سال تازیہ ابو عبداللہ الحسینی کا بہ خلوص نیت اندرون محل بجا لاتا تھا اور بندہ روضۃ الشہدا کا خلاصہ سناتا تھا لیکن معنی اس کے عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ اور فقرات پرسوز و گداز بسبب لغت فارسی ان کو نہ رلاتے تھے۔ اکثر یہ مذکور کرتیں کہ ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے۔"

نمبر ۱-۲-۳-۴-۵-۶ رسالہ لسان الملک جلد ا نمبر ۵ داستان اردو نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال مشمولہ رسالہ علی گڈھ میگزین از مولوی علی احسن پروفیسر علی گڈھ کالج۔

احاطۂ مدراس و بیجاپور وغیرہ کی نثر و نظم

دورِ عادل شاہی و قطب شاہی کے بعد

اب میں اپنے مضمون کو دو حصوں میں منقسم کرتا ہوں کیونکہ دکن کی دو بڑی اسلامی سلطنتوں یعنی قطب شاہی اور عادل شاہی کے شکست کے بعد کچھ عرصہ تک مغلیہ سلطنت کا دورہ دورہ ہوا اس کے بعد دکن میں ایک اسلامی سلطنت قائم ہونے تک طوائف الملوکی پھیل گئی تھی۔

نثر عادل شاہی سلطنت کے بعد ایک زمانہ دراز تک مجھے نثر کی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہوئی تاآنکہ خاک ویلور سے آگاہ[1] کا ظہور ہوتا ہے یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی تھی۔ کلایو اور دارن ہسٹنگز کا دورہ دورہ تھا فارسی کا چراغ گل ہو رہا تھا زبان اردو میں علمی سواد تقریباً کچھ بھی نہیں تھا۔ عام طور پر خصوصاً عورتوں کے لئے تعلیم کا دروازہ بالکل بند ہو چکا تھا اور یہ ناممکن تھا کہ فارسی میں جو مادری زبان باقی نہ رہی تھی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس نقص کے باعث سوسائٹی کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ سب سے پہلے جس نے اس نقص کی اصلاح کی کوشش کی اور اس کے صحیح علاج کو دریافت کیا وہ یہی مولوی محمد باقر آگاہ ہیں یہ سب سے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اردو زبان میں سیر، عقاید، فقہ کی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جیسا کہ خود آگاہ نے لکھا ہے ۱۱۸۵ھ میں انھوں نے یہ کام شروع کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ نہ تو فورٹ ولیم کلکتہ سے اردو زبان کی کتابیں شایع ہوئی تھیں اور نہ مولانا شاہ عبدالقادر نے قرآن شریف کا ترجمہ کیا تھا۔

اگرچہ آگاہ نے اپنی بیشتر کتابیں نظم میں تصنیف کیں کیونکہ اس زمانہ میں عام طور پر نظم ہی میں کتابیں لکھی جاتی تھیں مگر نثر کی جانب بھی انھوں نے توجہ کی تھی ان کی نثر کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"بعض علمائے متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ہیں ان سے فائدہ پاویں لیکن اکثر عورتاں اور تمام امیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں ہیں اس لئے یہ عاصی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ لیکر دکھنی رسالوں میں بولا ہے اور ہر رسالہ کے وزن علیحدہ ہونے سے خواہش و آرزو پڑھنے والوں کی زیادہ ہووے۔ پھر رسالہ اول کے مع رسالہ عقائد سنہ ایک ہزار ایک سو اور اسی

---

[1] سوانح مولانا باقر آگاہ از مولوی فاضل محمد مرتضیٰ صاحب

اور پانچ میں اور ایک ہزار و یک سوا و راسی اور چھ میں بنے ہیں پیچھے اس کے بہت ڈھیل
ہوی کیا واسطے کہ ایک رفیق با توفیق و جلیس و انیس کہ ان رسالوں کا طالب اور ایسے
خیر کے کاموں پر راغب تھا سو رحلت کیا۔ حق تعالیٰ اس پر رحمت کرے اور اُسے اپنی
مغفرت سے نوازے اور بہت موانع بھی درپیش ہوے ہر چند اس اثنا میں بعض دوستاں
واسطے دوسرے رسالوں کے بولے پن اتفاق ان کے بنانے کا نہیں ہوا آخر ایتداء سنہ ایکہزار
اور دو سو اور چھ میں رسالہ من درپن اور رسالہ من جیون بنانے کا اتفاق ہوا۔ ان
اٹھوں رسائل میں تخمیناً آٹھ ہزار اور چھ سو اپر پچاس بیت ہیں اور سرخیوں کے سات نو ہزار
بیت ہونگے اور ان سب رسالوں میں شاعری نہیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں
اور اردو کے بھاکے میں نہیں کہا کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں
ہیں اسی بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہیں کر کر سہل اور سرسری نجان کیا واسطے کہ بڑے
معتبر کتب سے تحقیق کر کر لکھا ہوں اگر وہ تمام کتاباں تو دیکھے گا یا کسی سے سنے گا تو تجھے
قدر ان رسالوں کی معلوم ہوے گی۔ اے بھائی اگر تجھے ان رسالوں میں کہیں شبہ ہووے
تو اپنے وہم و گمان سے اعتراض نہ کر بلکہ ان سب کتابوں میں کہ ان رسالوں کے اصل اور
ماخذ ہیں نظر کر کیا واسطے کہ میں بہت تحقیق و تدقیق کر کر لکھا ہوں ان کتابوں سے بھی
مقلدان کے مانند نہیں لیا ہوں بلکہ ان میں (جو واضح تھا سو اخذ کیا ہوں)[1]

مولانا باقر آگاہ نے ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا آپ کی اردو تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے:-
ہشت بہشت۔ تحفۃ الاحباب۔ تحفۃ النساء۔ فرائد در عقاید۔ ریاض الجنان۔ محبوب القلوب۔ روضۃ السلام
گلزار عشق۔ قصہ رضوان شاہ۔ روح افزا۔ خمسہ متحیرہ۔ مثنوی روپ سنگار۔

اب ہم ایسے زمانہ میں پہنچ چکے ہیں جبکہ ارکاٹ میں ایک اسلامی سلطنت قائم ہو چکی ہے والیان
ارکاٹ بھی ذی علم اور علم دوست تھے۔ اکناف ہند سے ارباب علم و ہنر کو انھوں نے جمع کیا تھا اور
خود بھی صاحب تصنیف تھے۔ چونکہ علمی زبان فارسی تصور کی جاتی تھی اس لئے صاحبان علم و فن کی تصانیف
عربی یا فارسی میں ہوا کرتی تھیں لیکن عام طور پر اردو مروج ہو چکی ہے۔ باقر آگاہ نے اردو نثر اور
علمی کتابوں کی تصنیف کا راستہ کھول دیا تھا اس لئے علماء وقت کا بھی اس جانب خیال ہونے لگا
چنانچہ شرف الملک مولانا محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ جو دربار والاجاہ کے مدارالمہام اور اپنے وقت کے

---

[1] سوانح باقر آگاہ[2] تاریخ النوائط از شمس العلما نواب عزیز جنگ مرحوم

جید عالم تھے۔ جن کا انتقال ۱۲۳۸ھ میں ہوا کیدانی فقہ حنفی کا ترجمہ فرمایا تھا۔ عبارت کا نمونہ درج ہے:۔

"او بوجھ کہ تحقیق بندہ آزمائی جاتا ہے درمیان اس کی کہ بندگی کرے خدا کی اور ثواب پاوے اور درمیان اس کی کہ گناہ کرے خدا کی اور عذاب کیا جاوی اور آزمایش تعلق رکھتے ہے سات شرعی چیزوں کی کہ کرے اوسی و سات خلاف شرع چیزوں کی کہ چھوڑ دیوے اسے اس واسطے ضرور ہوا بیان کرنا شرعی چیزوں کا و خلاف شرع چیزوں کا بیان کرنا معنے اُن کا حکماں اُن کے واسطے آسان ہونے کے اُپر طالب کے۔ جاننا اُن کا اور یاد رکھنا اُن کا اس واسطے کہتا ہوں میں کہ شرعی چیزاں چار قسم پر ہیں ایک فرض دوسرا واجب تیسرا سنت چوتھا مستحب و نزدیک ہے مستحب کی مباح اور خلاف شرع دو قسم پر ہیں ایک حرام دوسرا نزدیک حرام و مکروہ کی باطل کرنے والا شرعی چیز کو یہ تمام آٹھ قسم ہوئے[1]"

اس اردو کے علاوہ عربی و فارسی میں آپ کی (۲۷)[2] تصنیفات ہیں۔ مولانا باقر آگاہ کے بعد ان کے تلمیذ مولانا قاضی بدر الدولہ نے (خلف شرف الملک) جو دربار والاجاہ کے قاضی تھے اس کام کو جس کو آگاہ نے شروع کیا تھا پوری ترقی دی اور نثر میں مختلف کتابیں جو سیر۔ فقہ۔ عقائد۔ تفسیر وغیرہ پر مشتمل ہیں تصنیف فرمائیں چونکہ آپ کی زبان آگاہ کی زبان سے بہ لحاظ ارتقاء تدریجی زیادہ صاف تھی اس لئے آگاہ کی کتابیں عام طور پر غیر مروج ہوگئیں۔ آپ کے کل تصنیفات سے جن کی تعداد (۶۰)[3] ہے۔ اردو کی (۱۳) کتابیں ہیں جن کے نام بہ لحاظ فن حسب ذیل ہیں:۔

شمار	نام کتاب	فن	کیفیت	شمار	نام کتاب	فن	کیفیت
۱	کتاب فقہ شافعی	فقہ		۶	نثر الجواہر	سیر	حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی سوانح عمری۔
۲	ریاض النسواں	؍؍	مذہب شافعی کی جامع فقہ				
۳	رسالہ در احکام عدہ و وفات	؍؍		۷	خزانہ معدلت	اخلاق	
۴	فواید بدریہ	سیر	آنحضرت کی نہایت مکمل سیرت ہے جس پر مفصل بحث کی گئی ہے	۸	توشہ فلاح	مناسک	
۵	ہشت گلزار	سیر	حضرت صدیق اکبر کی مکمل حالات زندگی۔	۹	قوت الارواح	؍؍	توشہ فلاح کی مفصل شرح ہے کتاب کی ضخامت بڑی سائز کے (۸۰۰) صفحات پر ہے اس قدر ضخیم کتاب عربی میں بھی مناسک میں نہیں ہے۔

[1] تاریخ النوائط ۱۳۲ [2] ترجمہ کیدانی قلمی [3] تاریخ النوائط

شمار	نام کتاب	فن	کیفیت
۱۰	گلزار ہدایت	بدعتوں کے بیان میں	اس رسالہ میں نہایت معتدل روش اختیار کی گئی ہے حقیقی بدعتوں کے متعلق بلاخوف خطر سختی کے ساتھ اظہار رائے کی ہے اور سوسائٹی کے عیوب صاف صاف بیان کئے ہیں
۱۱	ترجمہ حصن حصین	حدیث	
۱۲	حواشی بر صحیح مسلم	״	
۱۳	فیض الکریم[1]	تفسیر قرآن مجید	اسکو مصنف نے مکمل نہیں کیا تھا کہ انتقال فرما گئے۔

فوایدِ بدریہ سیرۃ النبی کی بہترین تصنیف ہے مدراس اور بمبئی میں بیسیوں اڈیشن ہو چکے ہیں کتاب مبسوط ہے۔ ایک باب میں پیدائش سے وفات تک اور دوسرے باب میں صورت باجمال اور سیرت باکمال کا ذکر کیا گیا ہے۔

باب اول میں نہایت تفصیل کے ساتھ جملہ واقعات کا ذکر بعثت اور ہجرت کے سنین کے لحاظ سے کیا گیا ہے دوسرے باب میں شمایل کا ایسا بے مثل خلاصہ مرتب کیا گیا ہے جس سے زیادہ واضح اور بہتر ناممکن ہے۔ عربی الفاظ کے لئے نہایت موزوں و مناسب الفاظ لکھا اور پھر ایسا کہ پڑھنے والے کو مادری زبان کا لطف آئے اور نامانوس الفاظ نہ معلوم ہوں۔ درحقیقت نہایت کامیاب کوشش ہے۔ اس امر کا دعویٰ بلاخوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ فی زمانہ بھی ایسی مستند کتابیں معدودے ہی ہونگی دیباچہ میں فرماتے ہیں:۔

"لیکن دیکھا کہ بازار علم کا بہت کاسد ہو گیا ہے اور علم کے جاننے والے دنیا سے گذر گئے اب کوئی کتاب زبان عربی یا فارسی میں تصنیف کیئے تو کچھ فائدہ اس پر مترتب نہیں۔ جن کو ان زبانوں کی معرفت حاصل ہے اُن کے لئے بہت سے کتب موجود ہیں اور کسی کو خواہشمند بھی نہیں پایا تب زبان ہندی میں یہ کتاب لکھنا شروع کیا تا عوام مومنوں کو اس سے فائدہ حاصل ہووے اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال سے واقف ہو کر اُن کی پیروی خوبی کے ساتھ کریں"

حلیہ مبارک کو اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

---

[1] تاریخ النوائط

"آنکھیں حضرت کے بڑے تھے اور آنکھوں میں سرخی تھی اور حدقہ بہت سیاہ تھا۔ جب حضرت دیکھتے تو پورا دیکھتے اور آنکھیں نیچے کرتے پیشانی مبارک کشادہ تھی اور بھوں دونوں ملے ہوے اور کماندار تھے اور اس کے موے پورے تھے۔ بینی مبارک ہموار باریک اور بیچ اپیچ بلند تھی اور دہن شریف وسیع تھا۔ دندان مبارک نہایت سفید روشن براق آبداری اور رونق کے ساتھ تھے۔"

ایک جنگ کے واقعات کو یوں تحریر فرمایا ہے:۔

"مسلمانان بھی اپنی فوج آراستہ کر کر اُن کے مقابلے میں گئے اس قدر جنگ ہوا آخر زید بن حارث نیزوں کے ماروں سے شہید ہوے اور نشان کے تئیں جعفر بن ابی طالب لیکے جنگ پر مستعد ہوے دونو لشکر جب باہم خلط ہوے جعفر گھوڑے پر سے اتر کر اسکے ٹانچے مار کے جنگ شروع کئے۔ سیدھا ہاتھ اڑ گیا بائیں ہاتھ میں نشان لئے وہ بھی کٹ گیا تو چھاتی سے لگائی آخر شہید ہوے۔"

آنحضرتؐ کی بزم کا حال یوں قلم بند فرمایا ہے:۔

"بعد ہر وہ صحابہ کو کوری آنکھ دیکھنے لگا کہ حضرت کے روبرو نہایت ادب سے بیٹھے ہیں اور کچھ کام فرمائے تو اس کو کرنے دوڑتے اور وضو کئے تو اس پانی کو پینے ایک پر ایک گرتے اور بات پکار کے نہیں کرتے اور تعظیم سے حضرت کی طرف نظر جماتے ہیں۔"

مصنف مرحوم کی سب سے پہلی تصنیف ریاض النسواں ہے جس کو آپ نے ۱۲۲۴ھ ہجری میں تصنیف فرمایا جبکہ آپ کی عمر (۱۶) سال کی تھی یہ فقہ شافعہ کی بہترین کتاب ہے جس میں عقائد و احکام طہارت و عبادت بشرح و بسط جمع کئے ہیں۔ اس کتاب نے جس قدر عام نفع پہونچایا ہے اس کا بیان نہیں ہو سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ تمام ضروری مسائل عام فہم زبان میں بیان کرائے گئے ہیں کہ جس کے سامنے پھر دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

"کتاباں فقہ شافعی کے عربی زبان میں بہت تصنیف ہوے ہیں لیکن عورتاں اور اکثر عوام الناس کے تئیں زبان عربی سے کچھ آشنائی نہ ہونے کے سبب سے ان کے حاصل کرنے سے مقصر رہتے ہیں اس واسطے یہ عاجز چند مسائل فقہ کے زبان ہندی میں جمع کیا۔ تا لوگاں مستفید ہوویں۔"

اس کے بعد آپ نے مختلف باب میں اپنی کتاب کو تقسیم کیا ہے۔ اور اسکو کتاب کا نام

دیا ہے مثلاً کتاب الایمان۔ کتاب الطہارت۔ کتاب الصلوٰۃ وغیرہ اور پھر ان میں فصل مقرر کئے ہیں جن میں مختلف مسائل کو بیان کیا ہے۔ مسائل کے بیان کا طریقہ یوں ہے۔

"اول رکن اسلام کا بعد از کلمہ توحید کے نماز ہے اور نماز بے طہارت کے درست نہیں اور طہارت پاک پانی سے کیا چاہئے اور پانی مستعمل یعنی تھوڑا پانی جو ایک بار کسی فرض کام میں آیا ہے اگرچہ پاک ہے لیکن پاک کرنے والا نہیں ہے۔ فرض کام کیا مثلاً اس پانی سے غسل فرض یا وضو فرض کیا ہووے یا کوئی نجاست دور کیا ہووے۔"

آپ کی آخری تصنیف تفسیر فیض الکریم ہے جس کو آپ نے صرف سات پاروں تک ختم فرمایا تھا کہ سنہ ۱۲۸۰ ہجری میں پیام اجل آپہونچا۔[1]

نفس مضمون کے پہلے آپ نے نزول قرآن اور اس کے جمع کرنے اور تفسیر و تاویل پر بحث کی ہے اور پھر سورہ فاتحہ کی تفسیر اور اس کی فضیلت بیان کی ہے۔ آپ کی تفسیر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن کی آیت لکھتے ہیں اور اس کے معنی بیان کرنے کے بعد اس پر بحث کرتے جاتے ہیں۔ سحر کا حکم۔ کسب مباح۔ ربا۔ شفاعت۔ خدا رسول اور اولی الامر کے اطاعت۔ خلق آدم علی سورتہ۔ جہاد کرنے والے کا مرتبہ۔ اجماع امت۔ تحریف انجیل، ذبح وغیرہ عنوانات پر کافی بحث کی ہے۔ چونکہ مصنف کی یہ آخری تصنیف ہے اس لئے مختصر نمونہ اس کا بھی درج کرنا بے جا نہ ہوگا۔

"وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا۔ اور مضبوط پکڑو اللہ کی رسی سب مل کر۔ اللہ کی رسی سے مراد اللہ کا دین ہے یعنی دین اسلام کو اختیار کرو اس کو رسی سے تعبیر کیا۔ کیونکہ باریک تنگ راہ میں گزرنا چاہئے اور پیر پھسلنے کا اندیشہ ہووے تو رسی جس کی دونو طرف راہ کے دو جانب سے باندھے ہوں پکڑے تو اس کو خوف نہیں رہتا۔ حق کی راہ بھی بہت باریک تنگ ہے اکثر لوگوں کے پیر اس پر لغزش پاتے ہیں جس نے دین اسلام مضبوط پکڑا تو بڑے خوف سے نجات پایا بعضے کہتے ہیں اس سے مراد قرآن ہے کیونکہ جو اس کے احکام پر چلے گا تو اس کو نجات ہوگی .... الخ"

نزول الٰہی کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ اترتا ہے کر کے جو آیا اس سے اللہ کی رحمت اور بندوں پر متوجہ ہونا اور ان پر لطف اور مہربانی کرنا مراد ہے۔"

اس مختصر بیان سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ قاضی بدر الدولہ کی وجہ سے زبان اردو نے

---

[1] تاریخ النوائط

مذہبی علوم کے دائرہ میں کہاں تک ترقی کی تھی۔

قاضی بدرالدولہ کے بعد پھر کوئی اعلیٰ پایہ مصنف احاطہ مدراس میں پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ والی ارکاٹ کے لاولد فوت ہو جانے پر اسٹیٹ ضبط ہو گیا۔ اور سرکاری دفاتر کی زبان انگریزی ہو گئی۔ اردو اگرچہ مروج تھی لیکن قدیم امرا اور علماء ہنوز فارسی میں خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ نواب شرف الدولہ جن کا انتقال ۱۳۲۲ ہجری میں ہوا۔ زیادہ تر خط و کتابت فارسی میں کیا کرتے تھے اس سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ احاطۂ مدراس میں زبان اردو کا کیا درجہ رہا ہو گا۔

قاضی بدرالدولہ کے بعد اُن کے فرزند مفتی محمد سعید خاں نے اپنے والد کی جانشینی کے فرایض ادا کئے لیکن ۱۲۸۶ھ میں وہ حیدرآباد چلے آئے اور یہیں ۱۳۱۴ھ میں انتقال فرمایا۔ انھوں نے زبان اردو میں نو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جو عقاید۔ فقہ۔ تفسیر اور سیر پر مشتمل ہیں۔

میں نے یہ عرض کر دیا ہے کہ نثر اردو کو احاطہ مدراس میں قاضی بدرالدولہ کے بعد کچھ زیادہ ترقی نہیں ہوی اور وہ فصاحت و بلاغت کے چشمے جو شمالی ہند میں رواں ہونے لگے اس سے مستفید نہیں ہوی۔ زمانہ حال کے چند مصنفین کے نثر کے نمونے لکھے جاتے ہیں جس سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ فی زمانہ نثر اردو کا احاطہ مدراس میں کیا پایہ ہے۔

شمس العلما قاضی عبید اللہ صاحب جو بدرالدولہ مرحوم کے فرزند اور اس وقت احاطہ مدراس کے قاضی ہیں ذی علم و صاحب تصنیف ہیں متعدد کتابیں آپ کی تصنیف و تالیف ہیں منجملہ ان کے ایک کتاب تحفۃ الزائرین ہے جس میں ان احادیث کا ترجمہ کیا گیا ہے جو حرم کعبہ و حجر اسود وغیرہ سے متعلق ہیں یا اس رسالہ کو آپ نے عربی سے ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب کی عبارت کا نمونہ درج ذیل ہے جو ۱۳۱۸ھ کی لکھی ہوی ہے۔ " روایت کئے ہیں خطیب اور ابن عساکر نے جابر رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا حجر اسود یمین ہے اللہ تعالیٰ کا زمین میں مصافحہ کرتا ہے اس سے اپنے بندگان کو بندہ عاصی کہتا ہے۔ اس حدیث میں حجر اسود کو اللہ تعالےٰ کا یمین کر کے فرمانا وہ تشریف و اکرام کے لئے ہے۔ اور یہ ان احادیث صفات سے ہے جن پر ایمان لانا واجب ہے اور اس سے عضو جارحہ یعنی سیدھا ہاتھ مراد نہیں "

مولوی محمد غوث شرف الملک مرحوم کو فن ہیئت سے خاص دلچسپی اور شغف تھا۔ جدید ہیئت کے مسائل جو اس وقت ہندوستان میں نئے نئے پہنچ رہے تھے اس سے واقفیت حاصل کرنے کی پوری

---

(۱) تاریخ النوائط

جستجو فرماتے تھے اس شغف کا اثر اُن کی اولاد کو بھی گویا ارثاً ملا چنانچہ آپ کے فرزند قاضی بدرالدولہ کو بھی علم ہئیت کے اس حصہ سے جس کی مسلمانوں کو مذہباً خاص ضرورت لاحق ہوتی ہے پورا کمال حاصل تھا آپ کے بعد آپ کے دو فرزند یعنی مولوی حسین عطاء اللہ صاحب مرحوم مولوی محمود صاحب اس فن میں آپ کے پورے جانشین ثابت ہوئے۔

مولوی محمود صاحب جو مولوی حسین عطاء اللہ صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں صاحب تصنیف ہیں متعدد فنون میں آپ کی اردو تصنیفات ہیں۔ آپ کی ایک کتاب کی عبارت بطور نمونہ درج ہے :-

"معلماں قطب نما کے دائرہ کو بتیس حصے کرتے ہیں ہر حصہ کو خن کہتے ہیں آٹھ خن کا ایک ربع دائرہ ہوتا ہے ربع دائرہ کو نو حصے کرکے ہر حصہ کو درجہ کہتے ہیں ان خنوں کے نقطوں کے مقابل جو ستارہ طلوع ہوتا ہے یا غروب ہوتا ہے اس خن کو اس ستارہ کا مطلع یا مغیب کرکے نام رکھتے ہیں وے سولہ ستارے ہیں ان کے سولہ مطلع اور سولہ مغیب ہوئے۔"

"مدراس کا قبلہ مغیب ثریا کے داہنے طرف تھوڑا میل رکھتا ہے۔ خط مغرب سے اس کی شمالی جہت کی طرف ساڑھے تیرہ درجہ کے نقطہ پر ہے۔ اور بمبئی کا قبلہ خط مغرب پر ہے لیکن اس کے شمالی جہت کی طرف تھوڑا میل رکھتا ہے اور عدن کا قبلہ مغیب نعش پر ہے مگر تھوڑا داہنے طرف میل کرتا۔"

موجودہ زمانہ کے ایک اور بزرگ صاحب تصنیف مولوی قدرت حلیم صاحب ہیں آپ کی بھی متعدد تصانیف سیر وغیرہ میں ہیں ایک کتاب جواہر السیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہی جس کو مولف نے بطور مولود کے لکھا ہے چنانچہ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"جب سنہ تیرہ سو چودہ ہجری آغاز ہوا شاہد مقصود نے جلوہ دکھایا اور زیور اختتام سے آرائش پایا اور اس کا تاریخی نام جواہر السیر فی محامد امام البشر ہوا۔ یہ گنجینہ انوار دوازدہ روز ماہ ربیع الاول کے لئے بارہ جوہروں سے معمور ہوا۔ تا ہر روز ایک ایک جوہر نذر محفل مدح خیر البشر ہووے۔"

ہر جوہر میں انھوں نے اولاً قرآن مجید کی آیت یا اس عنوان کی کوئی حدیث لکھی ہے اور اس کا ترجمہ کرنے کے بعد واقعات قلم بند کرتے جاتے ہیں۔ عبارت کی طرز وہی ہے جو صدر میں ظاہر کی گئی ہے مثلاً دسویں جوہر میں اولاً ابی ہریرہ کی حدیث لکھی ہے اور پھر اس کا ترجمہ یوں کیا ہے :-

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نہ دیکھا میں نے کوئی چیز بہتر و خوب تر سیدنا رسول اللہ

صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے گویا آفتاب آپ کے چہرہ پر پھر رہا تھا۔ روایت کیا اس کو ترمذی اور بیہقی اور احمد اور ابن حبان نے اور ہند بن ابی ہالہ رضی سے۔ منقول ہے کہ چہرۂ مبارک آنحضرت کا چودھویں رات کے چاند کے مانند چمکتا تھا۔ علما کہتے ہیں کہ سیدنا رسول اللہ صلعم پر جو ایمان لاتا ہے اس بات پر بھی ایمان لاتا ہو کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس ذات شریف کو ایسا خوب و پاکیزہ بنایا تھا کہ ویسا کوئی نہ ہوا اور نہ ہوگا اور حسن و جمال ایسا عطا فرمایا تھا جو دیکھے یقین کرے کہ یہ بیشک رسول اللہ ہیں بشر کی کیا طاقت کہ آپ کے تمام اوصاف بیان کرسکے لیکن ہر شخص نے اپنے فہم کے مطابق کسی چیز کے ساتھ تشبیہ دی اور اپنی دانست کے موافق بیان کیا۔"

آپ کی ایک اور تصنیف ریاض الشہدا ہے جس میں فضایل اہل بیت اور مناقب و شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام بیان کئے گئے ہیں اس کتاب کو دس مجلسوں میں لکھا گیا ہے۔ تاکہ محرم کے دس روز تک پڑھی جائے اس کتاب کی طرز وہی ہے جیسی کہ جواہر السیر کی۔ یہ تالیف بھی ۱۳۱۴ھ ہجری کی ہے۔

"اے محبان آل نبی معلوم کیجئے کہ قصہ شہادت شہید کربلا قتیل تیغ جور و جفا نور دیدہ حضرت رسول الثقلین سیدنا امام حسین علیٰ جدہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا اس قدر جان سوز اور الم اندوز ہے کہ ناطقہ کی اعانت سے محل تقریر میں نہیں آسکتا ہے اور بواسطۂ خامہ و زبان مقام تحریر میں نہیں لاسکتا ہاں بقدر طاقت دل نیم جاں کے اور موافق قوت جان ناتواں کے سلک تحریر میں آتا ہے۔"

"اس وقت جناب امام پر شدت پیاس سے ضعف غالب ہوا قصد فرات کا فرمایا تاکہ پیاس کی حرارت کو تسکین دیوے شمر نے اپنی قوم سے کہا کہ حسین کو پانی پینے نہ دو کیونکہ اس وقت وہ مردہ ہیں اگر پانی پیویں گے زندہ ہو جائیں گے۔ وہ مردودان دین بلور کے کوزوں میں پانی بھر کر سیدنا امام حسین کو بتلاتے تھے لیکن ایک بوند پانی اس میں سے نہ دیتے تھے"

اس کتاب کی تصنیف سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ احاطہ مدراس میں مسلمانوں کے دو بڑے فرقے کس طرح شیر و شکر ہیں کیونکہ اس کتاب کے مصنف سنی بزرگ ہیں۔

نظم اب میں نظم کی جانب متوجہ ہوتا ہوں سلطنت عادل شاہی کی شکست کے بعد بھی بیجاپور با کمالوں سے خالی نہیں ہوا اچھے اچھے شاعر اپنی نغمہ سنجی سے محفل کو گرماتے رہے۔ اچھی اچھی مثنویاں لکھی گئیں مولانا تبرعلم ہتھ اولیا کی ایک مثنوی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ آپ کا مدفن چینجی علاقہ مدراس ہے۔

جو ناچی ذرا اسشیا نکوں چھوڑ — بلندی کی کٹ نے کسر مور مسور
عجب میں جو زرا ہد چھٹاک استیں — تماشکوں جوڑی نظر پاکٹ میں
ایسے دہات شوگشب میں ٹھار ٹھار — جہاں شو کھڑا ہے ہئی واں ہوی نہا
چلی جوں اگی ہوادار وجلائیں — گلستاں براہیم کا کر دیکھائیں
کنیئے جو نکہ اسے میں نوطاس رات — چلی کھرکوں اس کے شو کے برات
تلک یاں محل میں بے بیا باں نیک بخت — خوشی سات غارو سکو بلا کے تخت
بچھایاں مرصع کے کر سے اودھر — بندیا درمیاں پردہ باریک تر
بلایاں بران شوکوں باعزو ناز — سوز نارو جیو کاریں و نواز

محمود | محمود بیگ بیجاپوری ولی کے ہم عصر تھے فرماتے ہیں۔

لوگاں کہیں پتھر سوں کچھ نہیں ولیکن — جو کوئی پیا سوں بچھڑ وہ سخت پتھر ہے

صبائی | احمد آبادی اسی زمانہ کے بزرگ تھے اپنے وقت کے نظیر اکبر آبادی ہیں۔

زر سے ہے آشنائی زر سے ملے ہی بھائی — زر نہیں تو ہی جدائی دنیا میں جو ہی زر ہی

احمد | گجراتی اسی عہد کے شاعر ہیں عربی اور فارسی کے ساتھ سنسکرا اور بھاشا سے بھی واقف تھے فرماتے ہیں اور کس قدر صاف کلام ہے۔

احمد بتائیں کیا کریں اب راہ عشق میں — سر پر تو سانچہ پڑ گئی اور پانو تھک گئے

آگاہ | قبل ازیں نثر کے بیان میں میں نے مولانا باقر آگاہ کا ذکر کیا ہے۔ اور اس امر کو بیان کر چکا ہوں کہ آپ کی اردو تصانیف سے زیادہ تر نظم میں ہیں۔

ہشت بہشت جو اردو زبان میں اپنی نوعیت کی سب سے پہلی سیر کی کتاب ہے۔ تمام نظم میں ہے نظم کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

بحول و قوت پروردگار اب — میں لکھتا ہوں اسے با اختصار اب
بترتیب لطیف و حسن اسلوب — کہ جو دیکھے سو بولے ہے بہت خوب
اگرچہ معجزوں کے ذکر اندر — ہیں نسخے بھوت دکھنی اے برادر
ولے اکثر غلط اس کا بیاں ہے — محدث پاس جھوٹ اس کا عیاں ہے
حدیثوں میں نہ ہو جسکوں ٹھکانا — حرام ہے اس کا پڑھنا ہور پڑانا

نمبر ۱ و ۲ و ۳۔ تذکرہ میر حسن مرحوم سے مثنوی نحفہ اولیا قلمی

لکھا میں اس لئے یہ نسخہ خوب | با آئین بہیں و وجہہ مرغوب
ہیں من درپن رکھا ہوں نام اس کا | جلا دینا ہے دل کو کام اس کا
جب اس سے حسن مطلق ہے نمودار | ہوا یہ نام اس کے تئیں سزاوار[1]

اس بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ علمی طور سے بہ تحقیق آگاہ ہی نے پہلے اردو میں سیر کی کتاب لکھی لیکن معجزات کے بہت سے رسالہ اردو میں اس سے پہلے مرتب ہو چکے تھے۔

بہر حال علمی حیثیت سے آگاہ نے جو کام کئے ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ اور جب تک اردو زندہ ہے ان کا نام باقی رہے گا۔

یہاں یہ بیان بھی نامناسب نہ ہوگا کہ جس طرح ادب اردو کی آگاہ نے خدمت کی ہے اسی طرح عربی اور فارسی میں بھی انھوں نے اپنی یادگاریں چھوڑیں ان کی ادبی قابلیت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اپنے ہم عصر آزاد بلگرامی پر چار سو اعتراضات کئے تھے۔[2]

مولانا باقر آگاہ کے بعد عام طور سے مذہبی اور علمی کتب اردو میں مرتب ہونے شروع ہو گئے مگر چونکہ نظم کا طریقہ زیادہ تر مروج تھا اور آگاہ نے بھی نظم میں خامہ فرسائی کی تھی اس لئے دیگر اصحاب نے بھی جو مذہبی کتابیں تصنیف کیں وہ نظم ہی کو انتخاب کیا۔ چنانچہ مولوی محمد اسحاق صاحب نے ۱۲۱۰ھ میں ریاض العارفین نام ایک کتاب تصنیف کی جس میں انھوں نے اخلاقی گیارہ باب قائم کئے ہیں۔ ہر ایک باب میں اولیاء و علماء و سلف صالحین کے قصے اپنے بیان کی تائید میں پیش کئے ہیں۔

قاصد راہ سخن چابک خرام | تھا جسے ملک روایت میں مقام
کہ امیر المومنین شاہ جہاں | شمع فانوس سرائے لامکاں
ابن عم وزور بازوئے رسول | حامی دین خدا زوج بتول
شیر یزداں پیشوائے باشرف | شاہ مرداں رونق شہر نجف
تھے ریاضت اور عبادت میں مدام | غیر طاعت تھا نہیں کچھ اور کام

اس کتاب کو فارسی سے اردو میں نظم کیا گیا ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

فارسی سے تھی نثر یہ آشکار | میں کیا اس کو نظم سے زیب دار
فارسی کی بحر کی سیپی اندر | تھے چھپے یہ بے بہا لعل و گہر
میں نہنگ قلزم اخلاص ہو | فارسی کے بحر کا غواص ہو

---

[1] ہشت بہشت [2] سوانح باقر آگاہ از مولوی فاضل محمد مرتضیٰ صاحب۔

لایا باہر لعل و گوہر جب سے ۔۔۔ رکھ دیا بازار دکھنی میں اُسے

کتاب کا حجم (۱۲۶) صفحہ ہے جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے اس کو سات مہینہ میں ختم کیا گیا ہے

سات مہینے سات دن تک کھینچ رنج ۔۔۔ ہات میں لایا ہوں یہ پاکیزہ گنج

اسی کتاب میں اپنے ایک دوست یعقوب کا ذکر کیا اور اس کو نظم کا استاد مانا ہے۔

ہے مجھے ایک دوستدار دل سے پسند ۔۔۔ نام ہے یعقوب اس کا ارجمند

مجھ کو اس سے ہے نہایت اتحاد ۔۔۔ نظم لکھنے میں بڑا ہی اوستاد

جہاں تک میرا خیال ہے زمانہ مابعد میں اس قسم کی علمی و مذہبی نظموں میں کوئی زیادہ ترقی احاطہ مدراس میں نہیں ہوی کیونکہ تقریبًا ایک صدی بعد جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی زبان میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔

آداب النساء کے نام سے ایک کتاب سنہ ۱۳۱۳ھ میں طبع ہوی ہے جس میں عقاید و فقہ کے مسائل ہیں اس کا انداز بیان یہ ہے۔

اجی ماں بہن کلمہ گو بی بیاں ۔۔۔ سنو پہلے کلمے کے معنے یہاں

مقدم ہے وہ رکن اسلام کا ۔۔۔ عبادت کو ہے جان کے کام کا

ایک اور کتاب مصباح الحیات نام مولوی میر حیات علی صاحب میسوری نے تصنیف کی ہے جو سنہ ۱۳۱۶ھ میں طبع ہوی ہے۔ اس کتاب میں بھی عقاید۔ فقہ۔ اور نصایح۔ نظم کئے گئے ہیں اس کا طرز بیان یوں ہے

دیکھ قرآن بیچ فرمایا خدا ۔۔۔ میں محبت کے لئے پیدا کیا

تو عدم تھا میں دیا تجھ کو وجود ۔۔۔ اور فرشتوں سے دلایا ہوں سجود

سنو فرض واجب سو ہے حکم رب ۔۔۔ ہے سنت نبی سے بھی ہے مستحب

سنو فرض اسلام کے پانچ ہیں ۔۔۔ پڑھو خوب معنی سے کلمے کیتیں

لیکن ہم جب نظم کے دوسرے اقسام کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور شعرا کے کلام کو دیکھتے ہیں تو ہمیں بہت بڑا فرق نظر آتا ہے اور ہم بلا خوف کہہ سکتے ہیں کہ احاطۂ مدراس کے شعرا کا کلام بھی باوجود صاحب زبان نہ ہونے کے نہایت اعلیٰ پایہ کا ہوتا ہے۔ نواب غلام غوث خاں والاجاہ نواب مدراس اچھے شاعر تھے آپ کا فارسی کثیر کلام ہے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ نواب صاحب کا انتقال سنہ ۱۲۷۲ھ میں ہوا۔ اعظم تخلص فرماتے تھے۔

عشق میں یار کے دل اپنا لگا کر دیکھا ۔۔۔ خوب اس شمع کو میں نے بھی جلا کر دیکھا

آب سے اور بڑھے آتش یاقوت کی طرح ‏ ‏ آتش دل کو میرے جو بجھا کر دیکھا
سلسلہ برق کو پہونچا ہے دل سوزاں سے ‏ ‏ دفتر داغ کے میں نے جو اٹھا کر دیکھا
دشت میں وادی فرقت کے مریضوں کو ترے ‏ ‏ سانس ٹھنڈی سی بھری برق جو اگر دیکھا
ایک قطرہ کو مرے اشک کے پہنچا نہ کبھی ‏ ‏ تو نے اے ابر کئی سیل بہا کر دیکھا
فائدہ کچھ بھی بھلا ہو اے اعظم ‏ ‏ دل جو تو اس بت ناداں سے لگا کر دیکھا

ولہ

ناتوانی سے یہ عالم ہے ترے رنجور کا ‏ ‏ ہر قدم بانگ جرس ہو کاروان مور کا
تاک لے یکبار گر اس چشم میگوں کو تو پھر ‏ ‏ کیا عجب ہے پانی پانی ہو جو دل انگور کا
کیا ادا احساں زباں اس تیر مژگاں کا کرے ‏ ‏ مارے دم ہو دل نے جس کے عہد میں منصور کا
گر رہے یکساں یہ عالم حسن کا اس کے تو دل ‏ ‏ ایکدم میں جمع کر لے گا وہ ساماں طور کا
کاکل مشکیں سے اس کے ذو ہوا اعظم جتنے ‏ ‏ ہو دہ تاج سلیماں بیضہ بیضہ مور کا

ولہ

ہر چند نعرہ کرتے ہیں اس کو خبر نہیں ‏ ‏ لو اب تمہارے آہ میں کچھ بھی اثر نہیں
جب سے نظر نہ آئی ہے وہ چشم نرگسیں ‏ ‏ ہیں گرچہ آنکھ مجھ کو پہ نور بصر نہیں

ولہ

بحر الفت میں بہت کچھ آپ مارے ہاتھ پاؤں ‏ ‏ شیخ جی آوے ہو کب اس کا تمہارے ہاتھ پاؤں[1]

یہ ناممکن ہے کہ کل مشہور شعرا کے کلام کا نمونہ درج کر سکوں اس لئے صرف چند شاعروں کا ذکر کروں گا۔
دور حاضرہ میں احاطہ مدراس کے مشہور شعرا میں سب سے پہلے نواب عبدالرحمن شاطر کا نام لینا چاہئے جو اپنے کلام کے باعث تمام ہندوستان کی علمی دنیا میں مشہور ہیں جنکے کلام کی فصاحت و بلاغت کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش کرنے کے بجائے چند اہل قلم کے فقرات درج کرتا ہوں جس سے میرے دعوے کی دلیل بین طور پر واضح ہو سکتی ہے۔

مولانا شبلی صاحب نعمانی ۔ میں مدت سے آپ کی قادر الکلامی اور خوش فکری کا معترف ہوں آپ کے کلام میں فلسفیانہ خیالات جس خوبی اور برجستگی سے ادا ہوتے ہیں اس کی مثالیں اردو میں بہت کم ملتی ہیں۔

مولوی سید اکبر حسین صاحب اکبر ۔ آپ کی نظم دیکھ کر میں خوش ہوا کہ ایسی بلند اور بامعنی طبیعت کے مسلمان ہنوز اس ملک میں موجود ہیں۔

---

[1] دیوان اعظم

مولوی ذکاءاللہ صاحب۔ گو آپ مدراس میں رہتے ہیں مگر زباں دانی میں دلی اور لکھنو کے زبان داں اساتذہ سے کم نہیں۔

مولوی وحیدالدین صاحب سلیم۔ آپ کا مذاق سخن نہایت پاکیزہ اور سنجیدہ اور بلند ہے عام شعرا کے طرز کلام سے آپ کی طرز سخن کو کوئی نسبت نہیں۔

مولانا الطاف حسین صاحب حالی۔ اس قابلیت کی قدر نہ کرنا اور اس سے بے اعتنائی کرنا میرے نزدیک منجملہ ان گناہوں کے ہے جو ناقابل عفو ہیں۔ نہایت تعجب ہوا کہ احاطۂ مدراس میں ایسی صاف اور فصیح اردو ایسی پاکیزہ نثر و نظم ایسا لطیف اور صحیح مذاق کیونکر پیدا ہوا اور کہاں سے آیا۔ بلا مبالغہ و بلا تصنع آپ کے بعض شعروں کو دیکھ کر رشک ہوتا ہے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ آپ کی صفائی زبان آپ کے ہم وطنوں کے لئے سرمایہ افتخار ہے۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ آپ اصل میں ہندوستان کے رہنے والے ہوں گے مگر یہ معلوم کر کے کہ آپ کی پرورش بچپن سے مدراس میں ہوی ہے مجھے تعجب ہوا۔

مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی۔ میں نہایت مسرور ہوا کہ اہل مدراس نے شعر میں کس قدر ترقی کی ہے اس قصیدہ کے تمام اشعار قابل داد اور اکثر لایق صاد ہیں۔

نواب حیدر یار جنگ

مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔ ایسا کلام ہندوستانیوں کے لئے بھی مشکل ہے اور مدراسیوں کیلئے محال

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر۔ میں نہیں خیال کرتا تھا کہ ارض مدراس سے ایسا سخن سنج شاعر پیدا ہوسکے گا۔ آپ کا یہ قصیدہ ثابت کر رہا ہے کہ اردو زبان کو کوئی خاص خصوصیت شمالی ہند کے ساتھ نہیں ہے اگرچہ وہاں اس کا نشو و نما ہوا۔

مولوی غلام قادر صاحب گرامی۔ غرض میری یہ رائے ہے کہ آپ کے اس کلام کی تقریظ روح القدس ہی کو لکھنی فرض ہے اور ممکن ہے کہ لوح و قلم میں اعجاز عشق کی تقریظ روح القدس کے قلم سے لکھی گئی ہو۔ آؤ خاک مدراس میں ابو نصر فارابی اور رازی کو دیکھو۔

غرض کہ ان عالی قدر رایوں سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ شاطر کس پایہ کا شاعر ہوگا۔ آپ کے قصیدۂ اعجاز عشق کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

بے محل اٹھتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم ۔۔۔ کوئی ہے تجھ پر سوار اے ابلق لیل و نہار
جو ہر فرد آئینہ نادانی انساں کا ہے ۔۔۔ دو نو جانب ہیں برابر کے دلایل بے شمار
حرکت قسری ہے مشیک ذات فاسر پر دلیل ۔۔۔ گیند اچھالے ہیں یہاں مست قضائے ہشیار

ہم خدائی کرتے ہیں تیری بدولت اے خیال ——— ایک کن سے ہوتے ہیں عالم ہزاروں آشکار
قبلۂ دل عشق ہے اور کعبۂ جاں عشق ہے ——— ہم اسی کو سجدہ کرتے ہیں نہاں و آشکار
ہم کبھی کرتے تھے رم صیاد اب تو رام ہیں ——— خود چلا آتا ہے لے ڈالے ہوئے گردن شکار
دل وہ مقناطیس ہے زایل نہ ہو جسکی کشش ——— زلزلے گو جسم کے کشور میں آئیں بے شمار
ہو نہ ہو کافوریری ہے دلیل مرگ دل ——— سرد آخر ہو گئی جو آگ تھی دل زندہ دار
خفتہ بختوں کو کہیں آتی ہے نیند ایسا سماں ——— دل کے بہلانے کو ہے خواب عدم کا انتظار
مر چکیں ساری تمنائیں بجز ارمان مرگ ——— ایک بسمل فوج حرماں سے ہے گرم کارزار
ایک دل اور سیکڑوں بت نازکس کس کے اٹھائے ——— ہم نے ای آذر کیا دین حنیف اب اختیار
دکھ بھی ہے اور سکھ بھی ہے یاں آس بھی ہے یاس بھی ——— منعم و مفلس برابر کے ہیں دو نو حصہ دار
قوت بازو سے ساحل پر عمل کے کام لے ——— علم کا دریا ہے طوفاں خیز و ناپیدا کنار
مر رہے ہیں سب تمنائیں بقائے نام کی ——— فانیوں کو کیا غرض ہے تجھ سے اے لوح مزار
باغ سے جاتے ہیں ہم اچھا یونہی اے باغباں ——— کچھ گریباں گیر ہیں اور کچھ ہیں دامن گیر خار
انجمن میں ہم ہیں لیکن انجمن دل میں نہیں ——— زیب خلوت خانۂ دل ہے فقط تصویر یار
لیلی محمل نشیں کا ناقہ خود تیرا ہے دل ——— عرصۂ عالم میں ہے کیا خاک مجنوں خیر غبار
کون آتا ہے سر گور غریباں بعد مرگ ——— ڈھیر سے مٹی کے زندوں کو بھلا کیا کام یار
گو بظاہر مختلف ہیں فی الحقیقت ایک ہیں ——— ابر ہو باراں ہو یا شبنم ہو یخ ہو یا بخار
اس جبری کی مدح میں شاطر کوئی مطلع پڑھو ——— جس سے ہوں سیف زباں کے صاف جوہر آشکار

مندرجہ بالا انتخاب سے شاطر کے کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور شاطر کا رتبہ شاعری بخوبی ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ شاطر کے بعد دور حاضر میں اور بھی مختلف شعراء ہیں جن کا کلام شمالی ہند کے رسالوں میں اکثر شایع ہوتا اور پسند کیا جاتا رہا ہے۔ جن میں سے ایک خطیب قادر بادشاہ صاحب بادشاہ تھے جن کا حال میں انتقال ہوا ہے۔

اے خالق عرش و ارض افلاک ——— جہت اور مکاں سے ہے تو پاک
نزدیک نہیں ہے عرش سے تو ——— دوری نہیں اس زمیں سے تجھ کو
تیری توحید و یکتائی الٰہی تجھ کو شایاں ہے ——— تیری توصیف کا ہم کو نہ یارا ہے نہ امکاں ہے
تو واجب اور ہم ممکن تو باقی اور ہم فانی ——— مبرا تو ہے سب عیبوں سے ہم میں عیب و نقصاں ہے

نہ تو ہی منفصل ہم سے نہ ہم ہیں متصل تجھ سے
ہو اعلیٰ تیری ہستی تیری برتر عزت و شان ہے

پھلا پھولا نہ کیوں گلشن یہ ہی دنیا کی خلقت کا
ہر ایک ذرہ میں ہو جلوہ تری نیرنگ قدرت کا

ہر ایک پتہ چمن کا گویا دفتر ہے حقیقت کا
ہر ایک ذرہ میں ہو جلوہ تری نیرنگ قدرت کا

اشارہ ہو یہی ہر دم مری چشم بصیرت کا
ہر ایک ذرہ میں ہو جلوہ تری نیرنگ قدرت کا

روف احمد صاحب پرتو بھی[1] ایک مشہور شاعر ہیں جن کے اب تک تین دیوان شایع ہو چکے ہیں۔ اہل مدراس نے آپ کو رئیس الشعرا کا خطاب دیا ہے۔

پہلو سے میرے تنگ جو ہو کر یہ دل گیا
نام آبروئے عشق کا مٹی میں مل گیا

وہ گل جو کھل کھلا کے ہنسا باغ میں صبا
دل کی طرح چمن میں ہر ایک غنچہ کھل گیا

کس شوخ ماہرو سے مقابل ہوا فلک
سورج جو آج جانب مغرب جھل گیا

مجھ بے گنہ کے قتل سے حاصل ہوا نہ کچھ
مقتل سے قاتل آج بہت منفعل گیا

ولہٗ

اگر میں وصف لکھوں نخچۂ رنگین جاناں کا
سر دست اپنے خامہ پر ہو دھوکا شاخ مرجاں کا

فراق یار سے گھر میں بھی عالم ہے بیاباں کا
یقین ہو تار بستر پہ مجھے خار مغیلاں کا

ولہٗ

گریہ نے میرے گھر کو سمندر بنا دیا
ذرہ کو شیبہ حلہ سکندر بنا دیا

آنسو کو سوز ہجر نے اخگر بنا دیا
ہر ایک آنکھ کو میری مجمر بنا دیا

جلوے نے تیرے ہر صنم رشک ماہ کو
اے مہر حسن بزم میں پتھر بنا دیا

پرتو کہوں میں کیا لب دندان یار کی
صانع نے اس کو لعل سے گوہر بنا دیا

نواب صاحب کرناٹک کے ایک اور رشتہ دار محمد[2] منور صاحب گوہر ہیں جنکا قصیدہ حضور نظام حضرت غفران مکاں علیہ الرحمہ کے چہل سالہ جوبلی کا مشہور ہے۔

رات کو خواب میں دیکھا عجب اک رشک قمر
کہ نظیر اس کا کہیں آج تک آیا نہ نظر

جلوہ حسن میں وہ نور کا عالم پایا
کہ نظر میں نہ رہا جلوۂ خورشید و قمر

رخ روشن میں قیامت کی تجلی دیکھی
ایسا پر نور فلک پر نہیں کوئی اختر

گورا رنگ ایسا تھا اس ناز بھری صورت کا
صدقے سو جان سے ہو جس پہ سفیدی سحر

---

[1] دیوان بادشاہ [2] دیوان پرتو

چمن ناز کا بوٹا تھا کہ قد دلکش
علم فتنہ تھا یا باغ نزاکت کا شجر

تھی عجب ہوش ربا وہ روش مستانہ
صبر اپر بس نہیں چلتا تھا نہ قابو دل پر

الغرض میں نے یہ اس جان جہاں سے پوچھا
نام کیا ہے ترا تو کون ہے اے رشک قمر

ہنس دیا اس نے سنی جبکہ یہ تقریر مری
پھر کہا ہوش میں آ عقل گئی تیری کدھر

شاہ کی سالگرہ کی ہوں مبارک تصویر
دھوم جس جشن کی عالم میں ہو اب شام و سحر

مدح نامے میں پڑھوں مطلع دلکش ایسا
کہ پسند اس کو کریں سارے سخنداں سنکر

مرتبہ آصف سا دس کا ہے ایسا برتر
دیکھ کر جس کو سلاطین زمن ہیں ششدر

نام حضرت کا ہے محبوب دل اہل جہاں
شاہ محبوب کا ہر ایک کے دل میں ہے گھر

ختم کر اپنا بیاں رکھدے قلم ہاتھ اٹھا
مدح جب ہو نہیں سکتی ہے دعا کر گوہر

اب چند شعرائے حال کا کلام درج کیا جاتا ہے۔

شاکر دوانباری

جفاؤں کو نہ گن اے دل حساب دوستاں در دل
شمار شکوہ لاحاصل حساب دوستاں در دل

کروں تو خون کا دعویٰ کروں کس سے قیامت میں
جو منصف ہو وہی قاتل حساب دوستاں در دل

شمار زخم تیر ناز مجھ سے پوچھنا کیا ہے
مثل مشہور ہے قاتل حساب دوستاں در دل

نہ دو گن گن کے تم بوسے شمار اس کا نہیں زیبا
یہ دفتر میں نہیں داخل حساب دوستاں در دل

دیا کرتے ہیں وہ گالی لیا کرتے ہیں ہم بوسے
نہیں گننے کے یہ قابل حساب دوستاں در دل

یہ مانا آپ کا احسان مجھ پر بے نہایت ہے
جتانے سے مگر حاصل حساب دوستاں در دل

نہ شکوہ ہے جدائی کا نہ شاکر بے وفائی کا
بلا سے ٹل گیا گر دل حساب دوستاں در دل

سید شاہ محمد صبغت اللہ حسینی صاحب فخر

میں بندۂ حزیں ہوں بندہ نواز تم ہو
کوتاہ بخت ہوں میں گیسو دراز تم ہو

بھر دو در کرم سے مجھ بینوا کی جھولی
بے ساز و برگ ہوں میں بابرگ و ساز تم ہو

یہ شان بے نیازی اے خواجہ اور کب تک | محو نیاز ہوں میں سرمست ناز تم ہو
ہستی کے بھید سے اب آگاہ کر دو مجھ کو | جویائے کام ہوں میں دانائے راز تم ہو
جو آپ تک نہ پہونچا پہونچے جو کبریا تک | میں ہوں وہ پست ہمت وہ سرفراز تم ہو
ملتی نہیں تمہاری پرواز کی بلندی | مرغ خرد ہے قاصر وہ شاہباز تم ہو
اے میرے خواجہ تم سے کہتا ہے نور کا دل | میں آہن سیہ ہوں آئینہ ساز تم ہو

سید عبد العلا علام

صاحب دیوان شاعر تھے۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔

اے فلک آج بلندی پہ ہے اختر میرا | مجھ پہ ہے عکس فگن مہر منور میرا
پردۂ چشم عقیدت ہے مرا صفحۂ مشق | شاخ طوبیٰ سے بنا خامہ خوشتر میرا
مجھ کو فردوس میں جا نہیے یہی ہے منظور | در اقدس کے رہے سامنے بستر میرا

ولہ

تشنہ ہوں میں تو ساقی کوثر کے دید کا | شمس و قمر ہیں جس سے سدا آب و تاب میں
آتش فرقت سے جل کر سینہ مجمر ہوگیا | لخت لخت دل ہمارا شکل اخگر ہوگیا
آشنائے بحر عشق گوہر دنداں ہے دل | سلسلہ اشکوں کا اپنے سلک گوہر ہوگیا
کی ہے جو میں نے نعت ملا یہ صلا مجھے | صل علیٰ کہیں تو کہیں مرحبا ہوا

مندرجہ بالا انتخابات کے بعد اب میں اس حصہ کو ختم کرتا ہوں۔ کیونکہ میرے خیال میں اس قدر انتخاب کافی ہے اور اس سے زبان کی ترقی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

لے از دیوان علام مطبوعہ

اردو اور سلطنت آصفیہ

اب میں اپنے مضمون کے دوسرے حصہ کی جانب متوجہ ہوتا ہوں۔ خطۂ دکن ہمیشہ علم و ہنر کا قدردان رہا اور اکناف عالم کے باکمالوں کو اپنی طرف کھینچتا رہا ہے اور یہاں کے فرماں روا ہمیشہ گراں قدر وظائف اہل علم و فن کے لئے مقرر کرتے رہے ہیں۔

دکن کی قطب شاہی سلطنت کے بعد جب حضرت آصف جاہ اول حکمراں ہوئے تو چونکہ آپ کی علمی قدردانی ضرب المثل بن گئی تھی اس لئے آپ کا سادہ مگر بارعب دربار باکمالوں کا ملجا و ماوا تھا۔ ہندوستان کا مشہور ادیب جس کی عربی قابلیت کا لوہا "سبحۃ المرجان" کے باعث عرب بھی مانتے تھے یعنی مولانا غلام علی آزاد آپ ہی کے زمانہ میں اورنگ آباد تشریف لے آئے اور یہیں سے دارالبقا کا راستہ لیا۔

ولی جس کو ایک زمانہ تک شاعری کا باوا آدم تصور کیا جاتا رہا۔ اور در اصل شمالی ہند کے لئے یہ صحیح بھی ہے (کیونکہ اس کے پہلے وہاں شاعری کا وجود نظر نہیں آتا) اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ اردو زبان میں انگریزی فنون کی کتابوں کے ترجمہ کی ابتدا ہوئی تو یہیں دکن سے اور اردو کا پہلا علمی رسالہ شایع ہوا وہ بھی دکن سے۔ اور آج اردو کی یونیورسٹی قائم ہوئی ہے تو سلطنت آصفیہ ہی کے ہاتھوں۔ درحقیقت زبان اردو پر سلطنت آصفیہ کا اس قدر احسان عظیم ہے جو احاطۂ تحریر سے خارج ہے اور بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کو جو کچھ ترقی نصیب ہوئی یا اب آیندہ ہوگی وہ تمام اسی سلطنت کی آبیاری کا باعث ہوگی۔ اب میں اپنے مضمون کو چار دوروں میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں تا معلوم ہو کہ ہر دور میں اردو کی کیا ترقی ہوئی۔

دور اول

از سنہ ۱۱۳۲ ہجری تا سنہ ۱۲۲۱ ہجری

جب آصف جاہ اول دکن کی جانب متوجہ ہوئے تو بہت سارے اہل کمال بھی ہمراہ رکاب ہوئے جنھوں نے دکن ہی میں اقامت کی اور یہیں کے ہو رہے اور کچھ ایسے صاحب علم و فن تھے جنھوں نے دہلی کے سونی ہونے پر دکن کو ہی اپنا ملجا و ماوا قرار دیا۔

آصف جاہ اول جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے نہ صرف قدردان علم اور علم دوست تھے بلکہ خود بھی

ذی علم تھے آپ کو شاعری سے خاص مناسبت تھی آصف تخلص فرماتے تھے فارسی میں آپ کا کلام بکثرت ہے۔ اردو میں بھی آپ نے طبع آزمائی فرمائی ہے۔ چنانچہ

کالی نکھو کوئی میرے دلبر کو حد سی
مجھ دلکن کلیمیں یہ دعائے یمنی ہے[1]

آپ کے درباری امرائے نامدار بھی اچھے اچھے باکمال شاعر تھے۔ آپ کے بعد بھی یہی حال قدردانی علم کا رہا دربار کے امراصاحب تصنیف و تالیف ہوا کرتے تھے۔ مختلف تذکرہ جات قلم بند ہوے۔ چنانچہ ۱۱۷۵ھ میں لالہ لچھمن نرائن صاحب شفق نے "چمنستان شعرا" نام ایک فارسی تذکرہ شعرا کے حال میں لکھا ہے۔ جس میں اردو اشعار بھی موجود ہیں۔ اسی طرح ۱۱۹۷ھ میں موسوی خاں نے ایک تذکرہ اسی طور کا قلم بند فرمایا[2] ہے۔

ان تذکروں میں نہ صرف جنوبی ہند کے شعرا کا حال لکھا گیا ہے بلکہ شمالی ہند کے شعرا کو بھی جگہ دی گئی ہے چنانچہ خان آرزو اور سودا کا حال بھی درج ہے۔

ان کے مطالعہ سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ کلام صاف تشبیہ و استعارہ سے پاک اور اگر تشبیہیں دی گئی ہیں یا استعارہ کو کام میں لایا گیا ہے تو عام فہم ان لوگوں کے کلام میں تکلف نہیں ہوتا معمولی باتیں سیدھے سادہ طریقہ پر عام فہم تشبیہات کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ پرانے الفاظ جواب بالکل متروک ہیں ان کے کلام میں بہت نظر آئیں گے۔ لیکن جو لفظ استعمال کئے گئے ہیں وہ نہایت صفائی اور کمال سے جڑے ہوئے معلوم ہوں گے۔ کلام میں فارسی اور عربی الفاظ مناسبت سے شامل کر دیتے ہیں جس سے اُن کے کلام کی خوبی دوبالا ہو جاتی ہے اور معمولی شعر کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

دکن میں جو الفاظ روزمرہ بول چال میں کام آتے ہیں ان میں سے اکثر شمالی ہند کے اصحاب کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں مگر یہ الفاظ یہاں قدیم سے مستعمل ہیں جن کو مرزا علی لطف نے بھی اپنے تذکرہ گلشن ہند میں استعمال کیا ہے مثلاً "کرکے" بعد میں کی جگہ "بعداز" وغیرہ یہ الفاظ اکثر اس وقت کے شمالی ہند کے شعرا نے بھی استعمال کیا ہے مثلاً "بعداز" اس کو سوز نے بھی لکھا ہے کہتا ہے

ہے جیتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا — رہے گا مرگ کے بعداز مزار میں رونا

دکن میں عام طور پر "میں کہا"، بولتے ہیں تاباں نے بھی اس کو استعمال کیا ہے۔

---

[1] چمنستان شعرا قلمی [2] دونوں تذکروں کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔
[3] و [4] مقدمہ گلشن ہند۔

میں کہا عہد کیا کیا تمہارا ست ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

ذیل میں چند الفاظ لکھے جاتے ہیں جو ان کے کلام میں نظر آئیں گے۔

کون	بجائے	کو	جان	بجائے	معشوق	کن نے	بجائے	کس نے
تجھ لب	"	تیرے لب	سجن	"	معشوق	توں	"	تو
نت	"	ہمیشہ	جیوں	"	جب	انسے	"	اس نے
دوانہ	"	دیوانہ	کسو	"	کسی	ھور	"	اور
مکہ	"	منھ	سین	"	سے	اپس	"	اپنے کو

اس دور میں صدہا شاعر ہوئے جنھوں نے ملک سخن سے داد لی اور اپنے کلام کو یادگار زمانہ چھوڑ گئے۔ ان شاعروں میں بیسیوں ایسے ہیں جو دربار کے امیر اور صاحب مال و دولت تھے۔ بیسیوں ایسے ملیں گے جو صاحب حال درویش تھے پیری مریدی ان کے گھرانے کی میراث تھی۔ کوئی رند نظر آئے گا تو کوئی صوفی وقت ہوگا غرض ہر طبقہ نے طبع آزمائی کی ہے۔ اب اس دور کے شعرا کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) ولی اس دور کا سب سے مشہور شاعر ولی ہے۔ شمس الدین نام ولی تخلص اورنگ آباد وطن تھا۔ ۱۰۵۰ھ میں تولد ہوئے تحصیل علم کے لئے گجرات کا سفر کیا۔ حصول علم کے بعد ریختہ گوئی کا شوق ہوا اور اس میں ایسا کمال پیدا کیا کہ شعرائے ہند ان کو شاعری کا آدم ماننے لگے۔ ۱۱۵۵ھ میں انتقال ہوا۔ اگرچہ شمالی ہند میں اردو شاہ جہاں کے زمانہ میں اعلیٰ و اکمل زبان ہو چکی تھی۔ لیکن ولی تک وہاں نہ تو کوئی شاعر پیدا ہوا تھا اور نہ کوئی دیوان مرتب کیا گیا تھا[1] یہی وجہ ہے کہ میرزا صاحب کو بھی اعتراف کرنا پڑا۔ مولانا آزاد آبحیات میں ولی کو شاعری کے آدم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ولی کا وہی درجہ ہے جو عربی میں مہلہل فارسی میں رودکی اور انگریزی میں چاسر کو حاصل ہے۔[2]

ولی عالمگیر کے عہد میں پیدا ہوا اور محمد شاہ کے دربار میں ابو المعالی کے ساتھ معہ اپنے دیوان کے دہلی گیا اور شمالی ہند کے شعراء کا سرتاج بنا۔

ولی کا کلام عام طور سے مشہور ہے یہاں تک کہ یورپ میں بھی طبع ہو چکا ہے۔ اس کے کلام میں سلاست اور متانت پائی جاتی ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں تصوف کے خیالات عام تھے۔ اور ولی خود صوفی خاندان سے تھا اس لئے اس کی نظم کا سراپا تصوف ہی ہونا ناگزیر تھا۔

---

[1] آب حیات مولانا آزاد [2] آب حیات۔

اس کا دیوان اس عہد کے شاہیر کی بولتی تصویر ہے۔ ولی کسی کا شاگرد نہ تھا۔ بلکہ قدرت نے فطرتاً شاعر پیدا کیا تھا۔ اس مختصر بیان کے بعد ولی کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہونگا
جادو ہے ترے نین غزالاں سے کہونگا

دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی
یہ کشور ایراں میں سلیماں سے کہونگا

زخمی کیا ہے مجھ تری پلکوں کی انی نے
یہ زخم ترا خنجر بھالاں سے کہونگا

بے صبر نہ ہو اے ولی اس درد سے ہرگاہ
جلدی سے ترے درد کی درماں سے کہونگا

خوبی اعجاز حسن یار اگر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

کیا کہوں تجھ قد کی خوبی سرو عریاں کے حضور
خود بخود رسوا ہے اس کو اور کیا رسوا کروں

رات کو آوں اگر تیری گلی میں اے حبیب
زیر لب ذکر سبحان الذی اسرا کروں

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

ہر زباں پر ہے مثل شانہ مدام
ذکر تجھ زلف کی درازی کا

اک دل نہیں آرزو سے خالی
ہر جا ہے محال اگر خلا ہے

صحن گلشن میں جب خرام کیا
سرو آزاد کو غلام کیا

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق
کوچہ یار ہے یا گوشہ تنہائی ہے[1]

(۲) سراج سید سراج الدین سراج اورنگ آباد کے رہنے والے درویش منش پاکباز بزرگ تھے غالباً ۱۱۲۷ھ ہجری میں تولد ہوئے بہت پرگو شاعر تھے۔ صرف چار سال کے عرصہ میں ضخیم دیوان مرتب کیا۔ جس کے پانچہزار شعر ہیں۔ اس میں ردیف وار غزلیں مثنویاں۔ مخمس۔ ترجیع بند رباعیات سب ہی کچھ شامل ہیں۔ مضامین کی شگفتگی خیالات کی بلندی اور پھر کلام کی صفائی اور سادگی سے حیرت ہوتی ہے کہ اتنی صاف زبان جو آج کل بھی مستعمل ہو سکتی ہے اس وقت کس طرح احاطۂ تحریر میں آئی۔

میر تقی کا خیال ہے کہ سید حمزہ سے سراج کو تلمذ حاصل تھا اور میر حسن سید حمزہ علی کو استادی کا شرف دلانا چاہتے ہیں مگر دکن کے کسی شاعر کا نام حمزہ یا حمزہ علی نہیں تھا قیاس یہ ہے کہ سراج نے کسی کی شاگردی نہیں کی[2]

سراج نے دیوان کے علاوہ کلیات اور ایک مثنوی بوستان خیال یادگار چھوڑیں

---

[1] دیوان ولی [2] و [3] از رسالہ لسان الملک مضمون سراج۔ مولوی ظفر یاب خاں۔

۱۱۷۷ھ[1] میں انتقال فرمایا۔

ان کی زندگی ہی میں ان کے کلام نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی جو ایک طرف مجلس سماع میں صوفیا کو روحانی غذا بہم پہنچاتی تھی تو دوسری طرف باکمال شعراء کو کلام پر تعجب ہوتا تھا غرضکہ دکھنی شاعروں میں سراج اپنی نظیر آپ تھے۔ کتب خانہ آصفیہ میں ان کا قلمی دیوان موجود ہے اور میری نظر سے گزرا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

یار کا دیدار پا کر اے سراج — شکر رحمٰن کر کے تو واصل ہوا

آیا پیا شراب کا پیالہ پیا ہوا — دل کی دیر کے جوت کا کاجل دیا ہوا

نہیں حقیقت میں حسن و عشق جدا — طوق قمری ہے طرۂ شمشاد

کافر ہوا ہوں رشتہ زنار کی قسم — تجھ زلف حلقہ وار کے ہر تار کی قسم

ہرگز مریض ہجر کو بن وصل نہیں علاج — اس کی ادا کی نرگس بیمار کی قسم

تیرے بھوؤں کی یاد نے ٹکڑے کیا ہے دل — ہے ذو الفقار حیدر کرار کی قسم

دل ہے مثال بلبل و پروانہ شوقمند — اس شمع رو کے چہرۂ گلنار کی قسم

درشن دکھا کے آتش غم کو مرے بجھا — میں تشنہ لب ہوں درشن دیدار کی قسم

اس گلبدن کے شوق سے گلشن ہیں اے سراج — گلزار لالہ زار ہے گلزار کی قسم

اے سراج اپنی خودی کوں بیخودی میں محو کر — شغل جاری رکھ ہر ایک دم میں ہو الرحمٰن کا

شعر سراج ہر ایک ہے گلشن معانی — بو اس سخن کی پاوے جو خوش دماغ ہووے

اے سراج آرزوئے قند نہیں — شعر تیرا ہے جوں نبات لذیذ

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی — نہ تو توں رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بیخبری رہی

شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی — نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

سہی سمت غیب سیں کیا ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا — مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں — کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا — کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی

ترے جوش حیرت حسن کا اثر اسقدر سیں عیاں ہوا — کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری کو جلوہ گری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراج کوں — نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

---

[1] تذکرہ چمنستان شعراء قلمی۔

تجہ قبا پہ ہی نرگسی بوٹا — گویا نرگس کا پھول ابھی لوٹا
لعل تیری بہوں کی سنچی ہیں — کیوں نہ یاقوت کو کہوں جھوٹا
نیشرہ آہ سی غنیم جنوں — گلشن آباد عقل کوں لوٹا
عشق میں شوخ سنگدل کے براج — شیشہ ناموس تنگ کا پھوٹا

ولہ

عشق بازی میں جو کوئی جان کو ہارا ہوئیگا — عقل کو یار کے کوچے میں بسارا ہوئیگا
اے سراج اسکوں میسر ہے سدا مسند شوق — کسوت داغ سیں جو دل کو سنوارا ہوئیگا

ہر قطرہ اشک درد کا بحر عمیق ہی — مردم ہماری چشم کا اوسمیں غریق ہی
الٰہی آہ کو آتش فشاں کر — میرے آنسو کے پانی کو رواں کر

دریائے قناعت میں آزاد ہو جو آیا — درکار نہیں ہرگز کشتی میں اوسی لنگر

رُباعی

تجہ غم میں ہی رنگ زرد یاناں میرا — دشوار ہے ہر کسی کو پاناں میرا
درکار نہیں کہ تجہ گلی میں جاؤں — آناں تیرا ابھی ہے جاناں میرا[1]

(۳۳) صارم قبل ازیں میں نے بیان کیا ہی کہ زبان اردو میں ہر کس و ناکس نے طبع آزمائی کی ہی امیر سے لے کر ایک خانہ نشین فقیر بھی مستثنٰی نہیں کیا جا سکتا چنانچہ سراج ایک آزاد منش درویش تھے جس طرح انھوں نے اردو کی خدمت کی ہے اسی طرح اپنے وقت کے دیوان میر عبد الحی خاں صمصام الملک بھی اس کی خدمت بجا لانا اپنے لئے باعث فخر تصور کرتے ہیں۔ عبد الحی خاں سب سے پہلے شخص ہیں جن کو آصف جاہ نے قلمدان وزارت سے سرفراز فرمایا تھا آپ کا وطن اورنگ آباد ہے جہاں سنہ ۱۱۴۲ھ[2] ہجری میں تولد ہوے۔ سنہ ۱۲۲۱ھ[3] ہجری میں وفات پائی۔ صارم آپ کا تخلص تھا۔

اک آن میں حیف کھل گئیں یہ آنکھیں[4] — پھر موند پلک میں وہ نہ دیکھا رویا
میں مدت کے بعد ایک دم جو سویا — دیکھوں تو مجھ کنے ہے صنم گویا

سجن تجہ زلف میں ہل مل رہا ہے — ہمارے ہاتھ میں کب دل رہا ہے
نہیں کھلتا بہار و باغ سوں دل — یہی عقدہ مجھے مشکل رہا ہے

---

[1] دیوان سراج قلمی [2] و [3] تاریخ رشید الدین خانی [4] چمنستان شعرا و تذکرۂ موسوی خاں۔

از بسکہ تم اب عشق کی سیکھیں گھاتیں — سب بھول گئے شادی کے باتیں
مجھے گر جاں کنی کا حکم وہ شیریں ادا کرتا — کہاں اس کا خدا کی سوں لرے یارو بجاں کرنا

اس دور میں بیسیوں شاعر ہو گزرے ہیں جن کے نام اور کلام تذکرہ لالہ لچھمی نارائن و تذکرہ موسوی خاں سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ جن میں سے بعض مشہور حسب ذیل ہیں:۔

عاجز۔ یار۔ محرم۔ ایما۔ داغ۔ رنگین۔ مہر۔ پناہ۔ رضا۔ عزلت۔ عراقی۔ مہتاب۔ شرافت شہید۔ ضیا۔ کامل۔ مبتلا۔ نجم۔ ہمدم۔ درد۔ حشمت۔ حاجی۔ قادر۔ عزیز۔ فخر۔ فتوت۔ قدر

میرا مضمون طویل ہو جائے گا۔ اگر ان سب کے کلام کا نمونہ پیش کروں۔ اس لئے صرف چند کا کلام نقل کیا جاتا ہے۔ اس کلام کا کیا پایہ ہے اور اس کو کیا درجہ دیا جا سکتا ہے خود ناظرین اندازہ فرما سکتے ہیں۔

(۴) نور العین واقف متوفی ۱۱۶۵ھ ہجری

آتی ہے بوئے خوں مجھے اس لالہ زار سے — اے باغباں یہ کس کے شہیدوں کا کھیت ہے

(۵) محمد ماہ محرم شجاعت خاں صوبہ دار برار کے فرزند تھے ۱۱۶۶ھ میں وفات پائی۔

شاخ کی مینا کو کس شوخی سے لاتی ہے بہار — گل پہ شبنم نہیں ہے اسکو گل پلاتی ہے بہار

(۶) عاشق علی خاں ایما متوفی ۱۱۷۰ھ

طبیب عشق سیں پوچھا زلیخا نے علاج اپنا — کہا تجھ پر بھلا ہے سورۂ یوسف کا دم کرنا
عاشق نہیں ہے تجکو کچھ خوف معصیت کا — مونسی رضا نہیں گے امام ضامن اپنا

(۷) سید عبد الولی عزلت دربار آصفی کے امیر اور صاحب فن شاعر تھے آپکی ایک مثنوی "آگ لالا" بھی مشہور ہے۔

جیوں گل از بسکہ جنوں ہے میرا ساماں کے ساتھ — چاک کرتا ہوں ہیں لینے کو گریباں کے سات
دیکھ کر رنگیں چمن کا دل میرا غم ناک ہے — گل کے ہاتھوں جوں بلبل گریباں چاک ہے
بہار آئی ہے دوانو سننے ہو بلبل کے فریادیں — یہ آوازیں ہیں فوج موسم گل کے نقنوں کی

مثنوی راگ مالا۔

خدا کے حمد میں کہتا ہوں ہر دم — کیا ایک حرف سیں نے دو عالم
درود مصطفیٰ و آل اطہر — کہو ہوسے مو یو اپنا زباں کر
عمارت ایک سر کوب فلک تھی — در و دیوار میں مہ کے جھلک تھی

۱-۲-۳-۴ چمنستان شعرا و تذکرہ دکن۔

مرصع تخت پر بیٹھا جواں ایک کہ دولت اور طرب کا کامراں ایک
قبا، دلچسپ تھی سبز اس کے بر میں کلاہ سر معنرق تھی کہر میں
خط سبز اس کے روشن تھا نمایاں تعجب ہرا کا تھا گل سر ریحاں
اور اس کے گود میں تھی اک پری رو منہ اس کا فتنہ خیز اور زلف جادو
ہوا غرلت کا یا درہ حق تعالیٰ کہا اتمام نظم راگ مالا[1]

(۸) محمد مرتضیٰ مہدی [2] سنہ ۱۱۷۴ ہجری میں شہید ہوئے۔

چار دن بچھڑا صنم ہم پر قیامت آگئی مہدی حیرت ہے کہ تنہا خضر ابتک کیوں جیا
ہے کسی مکھ کا ناک دیدہ ہوا یوں جو آئینہ آب دیدہ ہوا

(۹) عزیز اللہ عزیز [3] اورنگ آباد کے رہنے والے صوفی بزرگ تھے اولیا میں ان کا شمار ہوتا ہے سنہ ۱۱۷۵ ہجری میں زندہ تھے۔

مجھ ناتواں میں کیا سکت جو بولوں لیاں کی صفت عاجز عزیز اللہ پر دکھن کے سب پیراں مدد
ڈرتا نہیں ہوں بانک وکٹاری کے زخم سے بانکی نگاہ دیکھ تری ٹل گیا ہوں میں

(۱۰) عارف الدین عاجز [4] جاگیر و منصب سے سرفراز تھے۔ ان کی ایک مثنوی "لعل و گوہر" بھی مشہور ہے سنہ ۱۱۷۸ ہجری میں وفات پائی۔

نوبہار آئی نہیں آیا میرا لال الغیاث آہ گل داغوں سے دل پھولیگا اس سال الغیاث
تم بن اب آہ دل میں کے لگی ہے کھٹ پٹ آنکھوں سے اشک پل پل گرتے ہیں لال پٹ پٹ
چمن میں جاکے وہ رنگیں ادا جب مسکراتا ہے گلوں سے رنگ رو کر لال ہی جنگل کو جاتا ہے

مثنوی [5]

کروں اُس دشت کی کیونکر صفت کو زباں پر کس طرح ڈالوں نعت کو
وہاں ہرگز نہ تھا پانی کا آثار اجل کا کھیت تھا وہ دشت خونخوار
بیاباں عدم کے تھا برابر وہاں تھا جہاں عزرائیل کو ڈر
وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی وہاں کے کانٹے بھالو کی انی تھی
وہاں کی باد تھی شوریدہ صرصر وہاں کی کنکری تھی مثل اخگر
بگولا تھا وہاں دن رات قائم وہاں تھکر سدا اندھی تھی دائم

---

[1] مثنوی راگ مالا قلمی ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ چمنستان شعرا۔ رسالہ لسان الملک۔ تذکرۂ موسوی خاں۔ مثنوی لعل و گوہر

کبھی سردی سیں ہر ہر کا یا تھا — کبھی گرمی سیں دم ہر لا تا تھا
کبھی رو تا تھا نیساں کوں نظر کر — غرض ہر حال میں کہتا تھا گوہر
جگی گو پر سو تھی بے یار و مونس — اٹھی انکھیا نکوں کھولی مثل نرگس
حکایت رات کی کر یا د روئی — کہی میں نیند پا کر لعل کھوئی

کہتے ہیں سنگ لاخ زمینوں میں ہم تو شعر — پانا ہماری شوخی معنی کو ہے مکٹ
شوخ مسجد کو چلا شیخ شتابی جھٹ جا — دیکھ ہو ئیگی تری دین کی خرابی جھٹ جا

(۱۱) مہر علی مہر[1] اورنگ آباد وطن تھا سراج کے ہم عصر تھے ۱۱۷۵ھ ہجری میں انتقال ہوا۔

خاک ہونا کیمیائے عشق کی تدبیر ہے — پارۂ بیتابی دل مارنا اکسیر ہے
آبرو پائی شجاعت نے عطائے فقر سے — موج نقش بوریائے جو ہر شمشیر ہے
پڑھ نماز یار تو ہر وقت رندوں کو نہ چھیڑ — تجھ کو اے زاہد پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ

اسی مضمون کو تقریبًا ایک صدی بعد خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی نے (متوفی ۱۲۷۱ھ ہجری) یوں ادا فرمایا ہے:—

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو — تجکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

یہ توارد بہت دلچسپ ہے۔

(۱۲) مرزا عطا رضیا[2]۔ متوفی ۱۱۸۳ھ ہجری

تجھے کیا یاد ہے ساقی وہ عالم بے حجابی کا — ادھر تو جام کا ہنسنا ادھر رونا گلابی کا
دیکھتے ہی اس کے خط کی شان دل مرجھا گیا — اس دھویں کو دیکھ آنکھوں میں اندھارا چھا گیا
ادھر تو تم بھوؤں کو تان کر تیوری چڑھاتے ہو — ادھر میں دل میں بسم اللہ بسم اللہ کہتا ہوں

(۱۳) فضلی[3] شاہ فضل اللہ اورنگ آباد کے رہنے والے صوفی مشرب بزرگ تھے ۱۱۸۴ھ میں وفات پائی۔

رکھا ہوں نیم جاں جاناں تصدق تجھ پہ کرنیکو — کیا سب تن کو میں درپن اچھو درشن نپا ہوں

(۱۴) منور الدولہ[4] احمد یار خاں یار امرائے دربار دکن سے تھے متوفی ۱۱۸۵ھ ہجری

بہار گلشن خوبی چمن میں آیا ہے۔ — کہاں ہے جام کہاں ہے شراب کا شیشہ

۱-۲-۳-۴- چمنستان شعرا۔ وتذکرہ موسوی خاں۔

گریباں چاک مطعون جہاں بدنام عالم ہوں　　پڑی خاک اس طرح کی ہائے رسوائی کے جھینٹے
صنم نے میرے سخن کو سن سن کہا کہ اتنا کہ مضطر ہو　　جو ابتدا کو نہیں سمجھتا تو کیا خبر ہو گی انتہا ہے

(۱۵) فخر الدین متوفی سنہ ۱۱۹۰ ہجری۔

یار ہر شان عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا　　بے نشاں عین نشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
گھر کے مصحف ہر چند پڑھے آیات کبیر　　نا زکشاف بیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
فخر دیں عمر سوں تھا جسکے بدل سرگرداں　　اس تعین میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

(۱۶) قادر خواجہ عبدالمنعم خاں سنہ ۱۲۰۰ ہجری میں انتقال ہوا۔

بلبل کو فصل گل میں اسیری ہوا ہی نصیب　　رکھتا ہے کس قفس میں یہ صیاد دیکھنا
بلبل ہوی ہے دام میں صیاد کے اسیر　　غنچوں کے کان کھولنے باد صبا چلی

(۱۷) موہن لال مہتاب متوفی سنہ ۱۲۰۰ ہجری

تشنہ لب ہوں شراب کی سوگند　　جل گیا جی کباب کی سوگند
کیا جھلک ہے سجن کے چہرے پر　　ازرزی کے جناب کی سوگند
دل صاحب ہے کیا پریشاں آج　　زلف کے پیچ و تاب کی سوگند

(۱۸) مرزا داؤد اورنگ آبادی شاگرد ولی۔

عزیزاں خواب میں دیکھا ہوں آج اس سرو قامت کو　　ہوا معلوم وقت آیا ہے میری سرفرازی کا
قانون شفا نطق میں ہے یار کے موجود　　اے دل نہ ہو محتاج طبیباں کی دوا کا

مرا احوال چشم یار سے پوچھ　　حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ
مرے حال پریشاں کی حقیقت　　صنم کے زلف کے ہر تار سے پوچھ
مری ہر یک صدائے آہ کا پیچ　　سجن کے پہرۂ بلدار سے پوچھ

(۱۹) محمد رضا بیگ رضا

کار دنیا کیجئے یا فکر عقبےٰ کیجئے　　عمر کا عرصہ نپٹ تنگ ہے اسمیں کیا کیجئے
اے رضا اپنی تمناؤں سے دل بالکل اٹھ گیا　　عشق کی راہ میں تسلیم و رضا لازم ہے

(۲۰) فدوی خاں فدوی

میں دیا جان کے تئیں جان کے جاناں اپنا　　جان من جان جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

۱-۲-۳-۴-۵-۶- چمنستان شعرا، تذکرۂ موسوی خاں۔

چپ عمر گنوایا میں ملا عشق سے دل — عشق یوں فیض رساں تھا مجھے معلوم نہ تھا
سہم مژگاں سے کیا تن کو مشبک میرے — شوخ دل ابرو کماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

(۲۱) صوفی شاہ کاظم

لام زلف و الف قد کو ترا جی دیکھ صنم — صفحہ حسن پہ کونین کے ہیں لا کھینچا
صلح ساقی کے قدم سے ہوئی عشرت کی مری — ہاتھ ساغر کا پکڑ گردن مینا کھینچا
آج گلزار میں ہے نیرنگ نہیں — باس غنچے میں نہیں گل کے تئیں رنگ نہیں

(۲۲) لطفی لطف اللہ دکھنی

تجھ عشق کی اگن میں شعلہ ہو جل اٹھا جی — دل موم کے نمونے گل گل پگھل گیا ہے
میں عشق کی گلی میں گھایل پڑا ہوا ہوں — جوبن کا ہاتھا آ کر مجھ کو کھندل گیا ہے

(۲۳) میر اکبر علی حاجی مظہر، تاباں اور سودا کا ہم عصر تھا۔

رکھتا ہے آج قتل کا دل میں خیال تو — عرصہ کے تیرے ہم نے یہ نظریں بچھائیاں
بھٹکتے باغ میں پھرتے ہو کیوں اے عندلیبو تم — چمن میں گل ہزاروں ہیں ہے اس گلکو ادیکھو
ہے نظر میں میری اس گل کے دبستاں کی بہار — جس طرح بلبل کو یاد آتی ہے بستاں کی بہار
اسکی دام زلف میں حاجی ہوا پابند آج — ہے پریشانی جس کی آئی سبستاں کی بہار

(۲۴) افسر اورنگ آبادی

یہ نہ سمجھو کہ میرا چاک گریباں ہوا — زخم دل پردہ نشیں تھا سو نمایاں ہوا
وہ سرخ لب غضب سے گر آوے سخن کے بیچ — کیا نقش ہنسئے واہ عقیق یمن کے بیچ
بے ہوش دیکھ یار نے افسر کو کہہ اٹھا — اس ناتواں کے چہرے پہ چھڑکو گلاب کو

(۲۵) محمد سیف اللہ انور

ہے نمایاں رخ پہ تیرے خط ریحاں آج کل — مور کے قبضہ میں ہے ملک سلیماں آج کل
عاشقوں کے قتل پر امروز فردا خواب میں — دیکھ کر ہو جائے گا کافر مسلماں آج کل

(۲۶) آشفتہ

سبز ہو نخل میری آہ کا بوٹا نکلا — قد دلدار ہوا سرو کا بوٹا نکلا
سجن کے مونہ سے نکلتی ہے اب شراب کی بو — چمن میں جس طرح مہکے گلاب کی بو

۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷ چمنستان شعرا، شفیق، تذکرۂ موسوی خاں۔

(۲۷) میر بہاء الدین حسین خاں عروج

روئے خوب اس کو دیا حصہ ہمیں بخت سیاہ — اس طرف صبح وطن شام غریباں اس طرف

(۲۸) فتوت شاہ عنایت اللہ نواب لشکر جنگ کے فرزند سراج سے تلمذ تھا۔

یہ سبکروحی تجھے معلوم ہے باد صبا — خاک پر جوں نقش پا ہیں خانہ بر دوش نہیں ہم

ان اقتباسات سے اس دور کی زبان کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے اب چند مثنویات کے مختلف نمونے پیش کئے جاتے ہیں جو اسی عہد کے شاعروں کی تصنیف ہیں۔

مثنوی وجدی اس تخلص کے دکن میں دو شخص شاعر ہوئے ہیں ایک وجدی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تھا جس نے "تحفۂ عاشقاں" لکھی اور دوسرے یہ وجدی جنھوں نے بارھویں صدی میں کئی ایک مثنویاں لکھیں ان میں سے ایک پنچھی نامہ ہے جس کا دوسرا نام پنچھی باچہ بھی ہے یہ شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے منطق الطیر کا ترجمہ ہے جس کو ۱۱۵۵ھ میں وجدی نے[1] ترتیب دیا ہے۔

بعض اصحاب "تحفۂ عاشقاں" اور پنچھی نامہ کے مصنف کو ایک ہی وجدی خیال کرتے ہیں مگر سنین کا لحاظ کریں تو صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ تحفۂ عاشقاں کا مصنف پنچھی نامہ کا مصنف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تحفۂ عاشقاں ۱۰۱۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے اور پنچھی نامہ ۱۱۵۵ھ میں ظاہر ہے کہ اگر وجدی کی عمر ۱۰۱۵ھ میں کم از کم تیس سال بھی قرار دی جائے تو ۱۱۵۵ھ میں ایک سو ستر سال کی عمر ہوگی۔ حالانکہ یہ تقریباً ناممکن ہے۔

پنچھی نامہ دیکھنے کے پہلے مجھے بھی اس امر کا یقین تھا کہ ان دونوں مثنویوں کا مصنف ایک ہی شخص ہے خصوصاً جبکہ تحفۂ عاشقاں اور پنچھی نامہ دونوں شیخ فریدالدین عطار ہی کے کتابوں کے ترجمے ہیں مگر پنچھی نامہ دیکھنے کے بعد صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کا مصنف وجدی قطب شاہی نہیں بلکہ وجدی آصف جاہی ہے۔

پنچھی نامہ جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے ۱۱۵۵ھ میں تصنیف ہوا ہے ان کی ایک اور مثنوی ۱۱۴۵ھ میں مرتب ہوئی ہے ان دونوں کے نمونے ذیل میں درج ہیں:-

مثنوی ۱۱۴۵ھ کا نمونہ یہ ہے۔

دنیا میں رہ کے دنیا سوں جدا اچھہ — جدا ہو کر طلب گار خدا اچھہ

قلندر ہو کہ ست دے خود پرستی — دیوانا ہو کہ دکھلا جوش مستی

---

[1] اس کتاب کا قلمی نسخہ جو کسی قدر ناکمل تھا میری نظر سے گزرا ہے ۱۲۔

شراب عشق سوں کر دل کو سرمست ۔ پکڑ لے نیستی نا ہوی گا ہست

مراد دل سمجھ لی نا مرادی ۔ کہ غم سوں پانگا توں راہ شادی

بہشتی حور طوبی قد پری رخ ۔ مبارک شکل چہر فال فرخ

پری صورت ہی توں لیکن پری نین ۔ کہ انساں بن یو حسن دلبری نین

کہ لے روشن گہر ماہ جہاں تاب ۔ سو تجکوں جوانی کا اچھو لا ب

فلک اک گوشہ ایوان اس کا ۔ زحل سو کمتریں درباں اس کا

کرے مریخ واں خنجر گزاری ۔ اتی خورشید کوں چوکی کی باری

مقابل مطرباں کا راگ ہور رنگ ۔ بجی طنبور سر منڈل دف و چنگ

عجب دلکش ہی بزم مے پرستاں ۔ خصوصاً ہوے جب ہاے ہو مستاں

بیاں کیوں ہوے ادب میری حقیقت ۔ کروں کس کو وسیلا کس طریقت

کریگا کون میری کارسازی ۔ دوستی ہو یگی عاشق نوازی

اری دو جاری نہ چھوڑ اس داستاں کوں ۔ ولیکن چیر لی بھی داستاں کوں

یو ہی بیان خاتمہ جن شکر سوں لیا ہوں ۔ تاریخ جس کی ختم کا ایا ہی باغ جانفزا

۱۱۴۵ ھ

نمونہ از پنچھی نامہ

ای پنچھی پیارے سخن آغاز کر ۔ حمد سوں حق کے بلند آواز کر

شوق سوں ایسا او چایا باپ جہجا ۔ جو رہی تر لوگ کا عالم لوبھا

گلشن وحدت ہے تیرا آشیاں ۔ احدیت کا راز سب تجھ پر عیاں

وا ہو لائی باز او جلی وا ھوا ۔ کر تیری ہی دل میں مولا کی ہوا

سر کشے سب چھوڑا ہے ہو سرنگوں ۔ دردسوں کر دل کوں اپنی غرق خوں

کر تجھی ہی ہمت معنی بلند ۔ دل تکو مردار دنیاں سات بند

کر تجھے دنیاں عقبی پر نگاہ ۔ اک نیراں سر پہ نہ رگیکا کلاہ

جا بیٹھا دو نو جہاں سوں جب گذر ۔ بیٹھ ذوالقرنین کی جا بات پر

ایک دن سب جنگلی پنچھی جانور ۔ ملکر بیٹھے جمع ہو یک ٹھار پر

شوق سوں دلکی لگی مرغوں نی ۔ ایک ایکستے راز دل کا بولنی

نا کہاں باتاں میں بات یوں ۔ جی ہنکیاں میں بادشہ کو لی ہیں کن

ہی ہر یک فرقی میں ہر یک بادشہ　　نہیں ہمنکوں بادشاہ سو کیا کنا
بادشہ نہیں سو ہمیں کس کی کنوائیں　　کام اگر کچھ ہوی تو کس پاس جائیں
یو جہاں تو نہیں ہی خوف و خطر　　الحذر خوف و خطر سوں الحذر
کوئی زبردستے کرے تو جا بن کان　　داد اپنے رنج و غم کا پان کاں
بخشی جایں میری سب گناہ　　ہوی او جالا یہ میرا نام سیاہ
اس میں یا رب میرا ہوتا ہی کام　　شکر ہی جی ہوی پنچی با جا تمام

جب کیا تاریخ کا دل میں حساب
تب ہوا میزاں میں کیا خاصی کتاب[1]

مثنوی فیض عام قدس[2] مولانا سید شہاب الدین نے اس نام سے ۱۱۵۵ھ ایک ضخیم مثنوی سید محمد جونپوری کے حالات میں لکھی ہی۔ تاریخی نام فیض عام قدس ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ سنہ ۱۱۶۵ھ کی تالیف ہی مثنوی کا نمونہ درج ہی:-

کہئی ہیں صادقاں مل یوں لولاک　　جنوں کوں حق کیا روزی ہدایت
تولد جب ہوا وہ شاہ لولاک　　اتھا الایس خونیں بدن پاک
مطہر تھا بدن اس کا سراسر　　شفق میں جیوں اچھی پاکیزہ چندر
چلے پر یہاں سے پونچی شہ سفر کر　　اتھا وہ شہر جو احمد نگر کر
کہ جس ہنگام میں یو شاہ عادل　　کئی احمد نگر میں تھے منازل
سٹیا تھا قلعہ کا پایا نظام آپ　　کیا تھا ابتدا باغ نظام آپ
اتھا سلطان نظام اس شہر کا شاہ　　ہوا مہدی کے آتے سوں یوں اگاہ
تفضل کر دھریا اس ملک میں پا　　رہی طالع رہی کوئی دن گر اس جا
اول سوں تھا او شہ محتاج فرزند　　جو یک دلبند خاطر آرزومند
نہیں کیوں فیض عام قدس یو نظم　　ہی خیر الناس کے تاریخ کا بزم
جو کوئی بہر خدا اس کوں سنے گا　　ولایت کی چمن کی گل چنے گا

مثنوی اعجاز احمد نوازش علی شیدا نے اعجاز احمد نام آنحضرت صلعم کی سوانح عمری دو جلدوں میں تصنیف کی تھی سنہ تصنیف ۱۱۸۰ھ ہجری ہے ایک جلد میری نظر سے گزری ہی۔ زبان کس قدر

---

[1] پنچھی باچہ قلمی۔ [2] یہ مثنوی کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہی ۱۲

صاف ہے ملاحظہ ہو۔

لکھے راویاں ہے روایت صحیح | میں کرتا بیاں ہوں سنو تم صحیح
کہ بیٹھے تھے اک دن امام الرسول | مہاجر و انصار حاضر تھے کل
یہودی اک آتا ہے با احتشام | تھا نام اس کا عبداللہ ابن سلام
شرافت میں اس سا نہ تھا دوسرا | اتھا عقل میں علم میں وہ رسا
اے شیدا ہو مضمون یہ دردناک | کیا صبر اپنی گریباں کو چاک
کہاں تاب لاوینگے سن مومناں | بھلا ہے توں کر ختم رونا یہاں

شمایل نامہ اسی دور کے ایک شاعر عثمان تھے۔ آنحضرت صلعم کی سیرت میں شمایل نامہ لکھا تھا افسوس ہو سن تصنیف معلوم نہ ہوسکا کتاب میری نظر سے گزری ہے۔

الٰہی گلشن دیدار میں توں | نبی کی نور سوں کر دو جہاں کوں
محمد کے شمایل کوں سراپا | کیا اسرار تو گلین پوزیبا
محمد مصطفٰے دو جگ کے سرداؔ | ہر ایک امت کی ہو انکے تئیں لاج
نہ نکیں پل جو شاہزادوں کو ستاج | پنت بیکل ہیں حسنین کے باج
لکھا عثمان عاشق ہو شمائل | ہمیشہ کر رکھو گل میں حمائل

دور اوّل کی نثر

اب دور اول کی نثر کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں تصوف کے خیالات عام ہو رہے تھے۔ شعرائے باکمال کا کلام تمامتر تصوف میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔ حضرات مشائخین عظام نے نثر میں بھی اپنے خیالات کا اظہار مناسب خیال فرمایا جس کے باعث تصوف میں کئی ایک کتابیں لکھی گئیں۔ ذیل میں ایک کتاب سے اس کی عبارت بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے جس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ نثر کی ترقی کس رفتار پر تھی۔

معرفتہ السلوک شاہ ولی اللہ قادری خلف اکبر شاہ حبیب اللہ قادری نے معرفتہ السلوک لکھی ہے افسوس ہے سنہ تالیف معلوم نہ ہوسکا مگر اسی دور کی کتاب ہے کیونکہ شاہ صاحب کا انتقال محرم ۱۱۵۵ھ میں ہوا ہے۔ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے والد کے ارشاد سے اس کا فارسی سے ترجمہ کیا ہے

ط مشکوۃ نبوت قلمی مصنف علی الموسٰی قادری ۲ فارسی کتاب کا نام بھی معرفتہ السلوک ہے جو شیخ محمود قدس سرہ کی تالیف ہے

شاہ ولی اللہ قادری اپنے والد کے بعد ان کے جانشین ہوئے تھے شاہ حبیب اللہ صاحب کا سنہ انتقال مصنف مشکوٰۃ النبوت کو بھی معلوم نہیں ہے۔ بہر حال سنہ ۱۱۰۰ھ کے اوائل میں لکھی گئی ہے۔
معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نہایت مقبول تھی اور کثرت سے لکھی جاتی تھی میری نظر سے دو نسخے[1] گزرے ہیں ایک ۹ جمادی الاول سنہ ۱۱۹۵ھ کا لکھا ہوا ہے دوسرا اس سے قدیم ہے جس کا سنہ کتابت معلوم نہ ہو سکا۔

کتاب تصوف میں لکھی گئی ہے۔ واجب الوجود۔ نفس امارہ۔ نفس لوامہ۔ توحید افعالی۔ توحید وجودی وغیرہ عنوانات کے تحت اپنی کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ قرآن شریف حدیث اور قصصوں سے اپنے دعوی کو ثابت کیا ہے۔ نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

"صفت ہور سرانا بی خالق ہور شکر کرنا بی نہایت ثابت ہے اوس واجب الوجود کون جو ممکن الوجود کون ممتنع الوجود کی دائر میں پیدا کیا۔ ہور اپنی واجب الوجود کو اس دو نوں وجود سوں موجود ہور ظاہر کیا بزرگ ہے بزرگی اس کی ہور عام ہے نعمت اوس کی"

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:۔

من عرف نفس فقد عرف ربہ کے بیان میں بیان کروں ہور اس کی شرطاں کی شرح کون عیاں کروں کیا واسطا کہ سر من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے نکتین کے تحقیق کرنا بہوت مشکل ہے کیا واسطا کہ یو کام صاحب دل کا ہے نہ ہر یک بے دل کا ہے ہور عارفان نے اس بات میں بہوت کتاباں کئی ہیں"

"نفس لوامہ یعنی نفس ملامت کرتھارا بری فعلاں پر نفس لوامہ قلب سبب کے تعلق ہے یعنی سالک نے جس وقت سب باطن کے ہیں چلن کون قلب منیب میں کھینچا جو دو نفس امارہ کی ہن چلن تھی۔ اگر چہ نفس امارہ کیا تھا اما پاس اس کی باقی رہی تو لوز بچتا ہے۔ جو اس کوں نفس لوامہ دور کرے نفس لوامہ نفس امارہ کی برعکس ہے دو حکم کرتھارا بڑی صفتاں پر ہی جہونکہ کبر کینہ۔ حرص حسد غصہ عداوت ہور حکم کرتھارا خوب صفتاں پر ہی جہونکہ تواضع ہور علم رضا ہور صبوری اخلاص ہور محبت ا"

بولتا ہے کمترین مرید ہور و اپس ترین شاگرد جاروب کش درگاہ عالی ہور بارگاہ والا عاجز فقیر الحقیر محمد ولی اللہ حکم کئے منجکوں حضرت شہباز ولایت معدن ہدایت آفتاب عالمتاب بزرگ اولیا کے بری اتقیا کے ہور صدر نشین محمد مصطفی کے صاحب شریعت ہور طریقت کے دربار حقیقت ہور معرفت کے وارث محمد رسول اللہ حضرت شاہ حبیب اللہ قادری باقی رکھی اللہ العالی انو کون"

---

[1] کتب خانہ آصفیہ میں دو نوں نسخے موجود ہیں ۱۲

دورِ ثانی

از ۱۲۲۱ ہجری تا ۱۲۹۳ ہجری

اب ہم ایسے دور میں قدم رکھتے ہیں جبکہ دہلی سونی ہو چکی ہے اور اس کے باکمال ایک طرف لکھنو کا رخ کرتے ہیں تو دوسری طرف سرزمین دکن اپنی قدردانی کی کشش سے اپنی طرف کھینچتی ہے یہاں کی مسند وزارت پر مہاراجہ چندو لعل سا ذی علم سخن فہم سخن سنج متمکن ہے مہاراجہ کو شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی ہر وقت آپ کے دربار میں اس کا چرچا رہا کرتا تھا جس کے باعث دور دور سے اہل کمال اپنے محبوب وطن کو ترک کر کے دکن آتے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیتے تھے۔

مہاراجہ نہ صرف سخن فہم اور قدردان تھے بلکہ خود بھی ایک باکمال اور کہنہ مشق شاعر تھے آپکا تخلص شاداں تھا آپ کا اردو اور فارسی کلام مشہور ہے آپ کا کلام نہایت سنجیدہ مضامین شگفتہ اور پسندیدہ کا ذخیرہ ہے کلام کی رنگینی انداز کی جدت بیان کی بلندی آپ کے قادرالکلامی کے اعلیٰ شاہد ہیں آپ کے کلام کا زیادہ حصہ معرفت اور تصوف سے بھرا ہوا ہے۔ آپ کے دو دیوان ہیں اور شایع بھی ہو چکے ہیں جملہ اصناف سخن میں آپ نے طبع آزمائی کی ہے کلام کا نمونہ پیش ہے۔

بندہ ہوں دل و جاں سے میں اپنے صنم کا ۔۔۔ سایہ ہے میرے سر پہ تو اس کے ہی قدم کا
خورشید میں ہے نور تری مہر و عطا سے ۔۔۔ یہ وجہ ہے ہر ذرہ جو خورشید سے چمکا
جب غنچے نے سر اپنا گریباں سے نکالا ۔۔۔ بلبل نے قدم پر نہ گلستاں سے نکالا
نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا ۔۔۔ کچھ تو لے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا
شاداں تو سنا یار کو اک مطلع رنگیں ۔۔۔ گر آج کرے تجھ سے وہ گفتار محبت
ہے کام یہاں عاشق صادق کا وگرنہ ۔۔۔ اٹھتا ہے کسی سے یہ بھلا بار محبت
کرتا ہے کوئی خیر تو ایمان کے باعث ۔۔۔ ایمان ملا اس کو یہ قرآن کے باعث
باغباں خود لٹا رہا ہے دیکھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بھر لے جھولی کو تو ثمر سے آج
جامۂ یار کو کیا جامۂ گل سمجھا ہے ۔۔۔ خار کی طرح سے دامن دلدار نہ کھینچ
دل کو جب تک نہ کچھ علاقہ ہو ۔۔۔ کوئی لکھتا ہے بے سبب کا غذ

ؔ مہاراجہ چندو لال باضابطہ وزیر اعظم مقرر نہیں ہوئے تھے بلکہ پیشکار تھے مگر چونکہ کوئی وزارت کی خدمت پر مسند نشیں نہیں تھا اس لئے آپ ہی دیوانی کے فرائض بھی سنبھالتے تھے ۱۲

توہراک شئے میں ہے اور پھر ہے منزہ سب سے — کبھو شاداں کو دکھا دے گا تو اپنا دیدار

خوبرو معشوق پر شاداں کا یوں آتا ہے دل — جس طرح جائے پتنگا دوڑ کر سوی چراغ

نیکی کا کوئی کام آیا نہیں مجھے سے — کیا ہوئیگا انجام میرا کچھ نہیں معلوم

تو ہی غفار ہے مجرم ہوں ترا — خطا کیوں کر نہ ہو آخر بشر ہوں

خدا نے دی ہے کیا تاثیر وقت صبح صادق کو — اثر رکھتی ہے اکثر جو دعائے صبح صادق ہو

پردۂ چشم اٹھا دیدۂ تحقیق سے دیکھ — جب یگانہ وہ ہوا کوئی نہیں بے گانہ

دل کو سمجھ رہا ہوں میں دلدار کی متاع — اپنی جو ہے متاع وہ ہے یار کی متاع

موحد ہے تو یکتائی سے مت ٹل — نہ کہہ اپنی زباں سے دوسرا ہے

ہمیں کیا کام ہے دونو جہاں سے — ترا ملنا ہمارا مدعا ہے[1]

مہاراجہ کے کلام سے ظاہر ہے کہ کس قدر صوفیانہ رنگ غالب ہے۔ جب قدردان اس طرح صاحب کمال ہو تو کیوں نہ عام طور پر شعر و شاعری کا چرچا ہوگا۔ عام خاص ہر اک کو اس سے دلچسپی تھی۔ صاحب سیف بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے چنانچہ ذکر ہے کہ ایک دفعہ مہاراجہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا ؎

کون کہتا ہے اُسے پاؤں سے پاپوش اُتار

ہر ایک حاضر دربار کو اس پر مصرع لگانے کا حکم ہوا ہر ایک نے تعمیل کی۔ ایک سپاہی بھی حاضر تھا اس نے اجازت چاہی اور عرض کیا۔

صاحب عرش بلائے جسے پاپوش سمیت — کون کہتا ہے اُسے پاؤں سے پاپوش اُتار

سپاہی فوراً انعام سے سرفراز کیا گیا۔ مہاراجہ کی قدردانی نے دور دور کے باکمالوں کو دکن کی جانب کھینچا تھا ان میں سے ایک شاہ نصیر استاد ذوق بھی ہیں جنھوں نے چار دفعہ یہاں کا سفر کیا اور آخری دفعہ جو آئے تو ایسے آئے کہ دکن ہی کو مدفن کر لیا۔ یہاں آپ کے بہت سارے شاگرد تھے۔ نمونۃً آپ کے کلام کا درج کیا جاتا ہے۔

نے برق نہ شعلہ ہے نہ اخگر طپش دل — رکھتی ہے کچھ اب عالم دیگر طپش دل

فریدوں کوئی یا کہ بہرام ہوگا — ولے گور سے عاقبت کام ہوگا

طرفۃ العین کیا پیش نظر تو نے حباب — عقدۂ زندگی و مرگ کو حل دریا میں

ہوا پر ہے یہ بنیاد مسافر خانہ ہستی — نہ ٹھہرا ہے کوئی یاں اے دل محزوں نہ ٹھہریگا

[1] دیوان شاداں

اے ستم ایجاد ہم تجھ سے کہاں تک کہیں طرزِ جفا اور ہے رسمِ وفا اور ہے
نصیر یادِ جوانی عبث ہے پیری میں کہ ایک رنگ پہ رہتا نہیں جہاں کا رنگ
دیدۂ نقش قدم ایک نہیں ہے پامال سینکڑوں خاک میں گردوں نے ملائی آنکھیں
منصور سے ہزاروں اس صفحۂ زمیں پر نیرنگیِ فلک نے سر دار مار ڈالے[1]

مہاراجہ نے بہ کمال قدردانی ذوق کو کئی ہزار روپئے بھیجے اور انھیں حیدرآباد طلب فرمایا۔ مصرعِ طرح بھی اپنے مشاعرہ کا بھیجا۔ ذوق نے حاضری سے معذرت چاہی اور اسی زمین[2] میں دو غزلیں روانہ کیں جن کا مطلع اور مقطع درج کیا جاتا ہے۔

کل گئے[3] تھے تم جسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر
طرز میں اپنی غزل لکھ ذوق لیکن اب نہ جا عالمِ مضمون میں طرزِ تفتہ جاناں چھوڑ کر
جب[4] چلا وہ مجھ کو بسمل خوں میں غلطاں چھوڑ کر کیا ہی پچھتاتا تھا میں قاتل کا داماں چھوڑ کر
گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدرِ سخن کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

اسی طرح غالب بھی یہاں کے ذوقِ علم کے باعث اپنے آنے کا قصد کرتے ہیں۔

مہاراجہ کے دربار کے ایک مشہور شاعر حفیظ دہلوی تھے جنھوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہہ دیا تھا اور دکن ہی کو وطن کر لیا تھا۔ حفیظ کے کلام کے جادو نے مہاراجہ کو مسخر کر لیا تھا۔ مہاراجہ آپ کے کلام کے بے حد دلدادہ تھے۔ شہیدی[5] مرحوم کا خیال ہے کہ مبصرانِ سخن کے نزدیک آج کل فنِ شعر میں صرف تین شیخ ہیں۔ شیخ ناسخ لکھنؤ میں۔ شیخ حفیظ دکن میں۔ شیخ ذوق دہلی میں غرض کہ حفیظ اپنے زمانہ کا استادِ سخن تھا جس نے دکن کو اپنا ملجا و ماویٰ بنا لیا تھا کہتا ہے

لبِ جاناں سے جی اداس آیا ہم کو آبِ بقا نہ راس آیا
ہمارے دل میں یہ دردِ الم کا جوش رہا کہ سینہ داغوں سے دوکانِ گل فروش رہا
چاک سینہ ہو گیا دل سے صدا آنے لگی کھلتے ہی اس در کے جنت کی ہوا آنے لگی
خیالِ کاکلِ مشکیں پہ مجھ کو اوشس رہا کہ مثلِ کعبہ مرا دل سیاہ پوشش[5] رہا

دورِ اول کے بہت سے الفاظ اس دور میں متروک ہو گئے۔ لیکن پھر بھی جو الفاظ فصاحت کی کان سمجھے جاتے تھے آج متروک ہیں۔

مثلاً بلبل کو سودا نے کہیں مذکر کہیں مونث باندھا ہے لکھنؤ کے متاخرین یعنی آتش

---

[1] آبِ حیات ص ۲-۳ [2] دیوان ذوق ص ۱۱ [3] دیوان ذوق ص ۵ [4] تذکرۂ شعرائے دکن عبدالجبار خاں ملکاپوری

اور رند مذکر باندھتے آئے ہیں۔

سوداؔ

سنے ہے مرغ چمن کا تو نالہ اے صیاد ۔ بہار آنے کی بلبل خبر لگا کہنے

آتش ۔ سیر چمن کو چلئے بلبل پکارتے ہیں۔

رند ۔ جانور کا جو ہوا شوق تو پالے بلبل

اہل دکن دور اول میں مونث باندھتے ہیں مثلاً قدر کہتا ہے۔

بلبل ہوئی ہے دام میں صیاد کے اسیر ۔ غنچوں کے کان کھولنے باد صبا چلی

میر اکبر علی حاجی کہتا ہے۔

ہے نظر میں میری اسکل کے دبستاں کی بہار ۔ جس طرح بلبل کو یاد آتی ہے بستاں کی بہار

مگر دور ثانی میں کبھی مذکر باندھے اور کبھی مونث۔

شاداں ۔ جب غنچے نے سر اپنا گریباں سے نکالا ۔ بلبل نے قدم پھر نہ گلستاں سے نکالا

شاہ خاموش

چمن میں رہتی ہے بلبل ترس ترس کے پاس ۔ یہ شور کرتی ہے ہوتا قفس قفس کے پاس

دور ثانی کی نظم

اس عہد میں یوں تو شاعروں کی تعداد گنتی سے زیادہ تھی اور ان میں صاحب کمال بھی صدہا تھے لیکن ان کا کلام درج کرنا خالی از تطویل نہیں اس لئے صرف چند مشہور مسلم الثبوت شعرا کا کلام درج کیا جاتا ہے کہ جن کے کلام سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ دور ثانی میں نظم کا کیا طور تھا

(۱) خاموش شاہ معین الدین شاہ خاموش۔ بیدر کے رہنے والے صابریہ طریقہ کے بزرگ تھے آج تک آپ کا عرس ماہ ذی قعدہ میں بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے ۱۲۸۶ھ میں انتقال فرمایا آپ کا دیوان طبع ہوچکا ہے۔[1]

محفل یار میں خاموش ہے لازم تجھ کو ۔ مثل پروانہ پر و بال جلانا جانا

کفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا ۔ عاشقاں آپ بھلے اپنا دلارام بھلا

---

[1] تذکرہ اولیائے دکن عبدالجبار خاں ملکاپوری۔

شکل انساں میں خدا تھا مجھے معلوم نہ تھا ۔۔۔ حق سے ناحق میں جدا تھا مجھے معلوم نہ تھا
مطلع دل پہ مرے چھپا یا تھا زنگار خودی ۔۔۔ چاند بدلی میں چھپا تھا مجھے معلوم نہ تھا
ایک مدت حرم و دیر کو ڈھونڈا ناحق ۔۔۔ سیمبر بر میں چھپا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا
ہو کے خاموش عجب سیر و تماشا دیکھا ۔۔۔ رنگ بیرنگ ہوا تھا مجھے معلوم نہ تھا

ولہٗ

چمن میں رہتی ہے بلبل ترس ترس کے پاس ۔۔۔ یہ شور کرتی ہے ہوتا قفس قفس کے پاس
لبوں پہ آہ تڑپ دل میں دم ہے ہستی میں ۔۔۔ عجب اے لیلیٰ ادا ہے جرس جرس کے پاس
وہ شکل ہے دل پر داغ کی کہ گنبد پر ۔۔۔ چراغ جیسے ہوں روشن کلس کلس کے پاس
نہ قید کر ہمیں صیاد موسم گل میں ۔۔۔ کبھی تو اپنا لیچل قفس قفس کے پاس

ولہ

آشیاں اپنا گلستاں سے اٹھا لے بلبل ۔۔۔ باغ کو چھوڑ دے جنگل کی ہوا لے بلبل
باغباں کا ہے ستم دوسرے صیاد کا ظلم ۔۔۔ جان ان دونوں کے ہاتھوں سے بچا لے بلبل
چہچہے کرتی ہے کیا اس سے نہیں کچھ حاصل ۔۔۔ مثل پروانہ پر و بال جلا لے بلبل
بیٹھ اک جائے تو بس کر کے تصور گل کا ۔۔۔ کیوں اڑی پھرتی ہے ہر جھاڑ کی ڈالی بلبل
گل مقصود کی ہے چاہ تو کر چونچ کو بند ۔۔۔ غنچہ ساں آپ کو خاموش بنا لے بلبل

چڑھائے سولی پہ خاموش ہو کے جب منصور ۔۔۔ سوائے حق نہ نظر آئی دار آنکھوں میں[1]

(۳) فیضؔ ایک دوسرے صوفی المشرب بزرگ میر شمس الدین فیض تھے۔ ۱۱۹۵ھ میں تولد اور ۱۲۸۲ھ میں فوت ہوئے۔ آپ امرائے دربار دکن سے تھے۔ آپ کے فیض علم سے تمام دکن فیض یاب ہوا ہے۔ آپ کی کثیر تصنیفات ہیں اور کئی دیوان طبع ہو چکے ہیں۔[2]

کفر جو تھا دین میسر ا ہو گیا ۔۔۔ بت ہی نصیبوں سے خدا ہو گیا
کیسی دوا مجھ کو مسیحائے دی ۔۔۔ درد محبت کا سوا ہو گیا
موت کدھر آتی ہے دیوانی ہے ۔۔۔ فیض تو پہلے ہی فنا ہو گیا
حرم میں دیر میں جب کوئی روبرو آیا ۔۔۔ مجھے یقین ہوا بس تو ہی کہ تو آیا[3]

---

[1] دیوان شاہ خاموش [2] تذکرہ شعرائے دکن عبد الجبار خاں ملکاپوری [3] دیوان فیض

کسی کا کوئی بھی ممنون نہیں ہو کر انصاف ادھر سے میں نکل آیا ادھر سے تو آیا
اڑائیں جیب کی لاکھوں ہی دھجیاں میں نے مگر نہ قبضہ میں دامان آرزو آیا

نہیں فرق کچھ دیر میں اور حرم میں جو بت چاہتے ہیں خدا چاہتا ہے
تقاضا دیت کا مگر فیض اُن سے خدا سے کوئی خوں بہا چاہتا ہے

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم صنم ہم دیر ہم بت خانہ ہم بت ہم برہمن ہم
در و دیوار ہے نظروں میں اپنے آئینہ خانہ کیا کرتے ہیں گھر بیٹھے ہوئے آپ اپنا درشن ہم
نہ قیل و قال سے مطلب نہ شغل اشغال ہی مطلب مراقب اپنے رہتے ہیں جھکا کر اپنی گردن ہم
کب اٹھتے ہیں اٹھانے سے کسی شیخ و برہمن کے در دلبر پہ اپنے مار کر بیٹھے ہیں آسن ہم
ہوا اے فیض معلوم ایک مدت میں ہمیں تھے وہ جپا کرتے تھے جن کے نام کی دن رات سمرن ہم[1]

(۳) قیس محمد صدیق قیس متوفی ۱۲۳۱ھ۔ خواجہ میر درد اور میر کی وضع و طرز کا پیرو تھا غزل کے ساتھ قصائد بھی مشہور ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ میں قلمی ضخیم دیوان موجود ہے۔

آج صحن گلستاں میں سے ہے عالم نور کا ہر رگ گل میں جھگڑا ہے چراغ طور کا
شمع سے تشبیہ دوں میں کیونکر اپنے یار کو وہ تو ہو کون سراپا یہ ہے پتلا نور کا
کون کہتا ہے کہ عارض پر ہو یہ خال سیاہ صبح کے پہلو میں ہے بچہ شب دیجور کا
زلف میں الجھا ہو کب جھمکا زمرد کا مگر شاخ میں سنبل کے ہو خوشہ لگا انگور کا
اس لئے کرتا نہیں میں قیس پہلو سے جدا کیونکہ دل میرا ہے پروانہ چراغ گور کا

وہ گول گول کچلیں اس کے دیکھتے ہی حباب غریب شرم کے مارے غریق آب ہوا
لڑی ہو دیدۂ میگوں سے آنکھ جس دن سے ہمارا شیشۂ دل شیشۂ شراب ہوا
نہ فکر ہستی ہو اس کو نہ ہے غم محشر نثار دل سے جو فرزند بو تراب ہوا

جب اٹھ کے اپنے گھر کو وہ رشک قمر گیا یک تازہ اور داغ کلیجہ پہ دھر گیا

بعد از فنا بھی ہم کو رہا پاس یار کا دست دعا کے جائے ہو سبزہ مزار کا

یہاں ایڑیاں رگڑتے ہیں بیٹھے زمین پر وھاں چرخ ہفتمیں پہ ہو اتیک دماغ عشق

تیری عارض کے اگر سامنے آجائے سحر عکس پیدا کرے آئینہ تصویر میں گل

نکالیں گے ہم اپنی حسرت دل جو ہاتھ آؤ کسو دن رات کو تم

[1] دیوان فیض ۱۲

وہ چاہے نہ چاہے قیس ہم کو — یہ بندۂ جان نثار ہیں ہم

بوسہ اس لب کا لئے بن یہاں سے کیا جاتا ہوں — کیا مجھے ناداں سمجھ باتوں میں بہلاتے ہو تم

دیکھتے ہی دور سے وہ شوخ کہتا ہے مجھے — کس لئے کس واسطے کیوں کاہکو آتے ہو تم

قیس کے آنے سے گر تکلیف ہوتی ہو تمھیں — یہ لو اٹھ جاتا ہوں کاہکو گھبراتے ہو تم

پنجۂ مژگاں کف افسوس ملتا تھا بہم — دیکھ کر بنگلہ یہ اس مہ رو کے خس کے ٹٹیاں

چھٹ گئے چلون جو شب اس شمع رو کے روبرو — پھونک دی طاقت نے سب اپنے ہوس کی ٹٹیاں

اس صفت مژگاں کا عالم کیا کہوں ہیں تجھسے قیس — دیکھ کر غش کر گئیں جس کو اسیں کی ٹٹیاں

مر چلے ہیں جس کے ہم فرقت سے وہ آتا نہیں — کیوں لے جی کیا دیر ہے اب تو نکل جاتا نہیں

جبکہ وہ آئینہ رو پہنے ہے چنکر آستیں — ہر شکن سے اپنے دکھلاتے ہے جو کمر آستیں

گل میں یہ بو ہے نہ غنچہ میں نہ مشک و عطر میں — جس قدر اس گلبدن کی ہے معطر آستیں

بیقراری ہے درد فرقت سے — سانس لینے کی کس کو فرصت ہے

گردش چشم سے کیا ساغر جم چرخ میں ہے — چرخ کو بھی جو میں دیکھا تو بہم چرخ میں ہے

قصیدہ

کیا نخل دعا نے دوستو کس کی ثمر پیدا — ہوئی گویا کف بیضائی موسی سے سحر پیدا

عبادت خانہ مشرق سے رہبان فلک نکلا — رخ پر نور سے ہو جس کے سجدے کا اثر پیدا

ملا صندل جبیں پر صاف شاشی گردوں نے — نہ ہوتا چرخ کو تا صبح محشر درد سر پیدا

ہمائے آسماں کا جلوۂ پرواز رنگیں ہے — شعاعی نور زر سے کئے کیا بال و پر پیدا

مبارکباد کی ہو دھوم رقاصان عالم میں — کیا ہے زہرۂ اظہر نے دو آہنگ تر پیدا

قمر سے تا عطارد پاے کو سے مسی ستاروں کی — بساط اطلس اخضر پہ جبیں ہے سر بسر پیدا

چمن نے اس خوشی میں حلۂ گلرنگ پہنا ہے — کہ جس کے ہر رگ و ریشہ سے ہے گوہر زر پیدا

نسیم صبح یوں پھرتی ہے لہراتی گلستاں میں — غبار راہ میں ہو جوں برید خوش خبر پیدا

بھرا ہے ہر قدح لالہ کا آتا شبنم تر سے — کہ ہو جوں حقۂ یاقوت میں عقد گہر پیدا

نکالے ہیں ریاحیں طرفہ تر شاخ صنوبر سے — ہوا ہے بید مجنوں بھی چمن میں بارور پیدا

مرصع پوش ہو شمشاد سر سے تا قدم ایسا — ہوا ہر حلقہ قمری سے ہے طوق کمر پیدا

ترانے گا رہی ہیں بلبلیں یوں شاخ گلبن پر — کہ ہر ہر کے ترنم میں ہو آہنگ دگر پیدا

سنا جس نغمۂ تر کو بھی اس سے تر روش ہے — ہوا نواب کے دل بند کو لخت جگر پیدا

محاورات بیگمات از قیس

چٹکیاں لے کے میرے ران میں کہتے تھے یوں — مجھ کو منگوا دے کوئی چھلکے تو نہال دوا

ہوئی ہوں تیرے قربان میرے کوکا — منہ پر تو دوشالہ کو مت تان میرے کوکا

سچ کہہ تو میرے سر کی قسم ہے تجھے ہوا — سچا نہیں ہے یہ تو ہے جھوٹا ازار بند

راحت افزا سے یہ کہوا جی گلشن بوبو — ہاتھ دھونے کو میرے لائیو بیسن بوبو[1]

(۴) صفا | اس عہد کا ایک اور مشہور شاعر ذوالفقار علی خاں "صفا" ہے ؎

جب ترقی ہو تنزل تو بھلا کیا ہوتا — قطرہ ہوتے جو تھا رہ گیا دریا ہوتا

پیر نابالغ اگر ہو کے جیا مرد تو کیا — اس کو یکساں ہے جواں مرد کہ بڈھا ہوتا

رتبۂ فکر تو اب عقل سے گزرا ہے صفا — ایک زنجیر کا باقی ہے کھبیڑا ہوتا

میں جا کے کیا کروں گلزار میں دل نہیں لگتا — بغیر تیرے کہیں یار دل نہیں لگتا

خدا واسطے منہ بند رکھیو اے ہمدم — ہمارا ذکر کچھ اس کے حضور مت کیجو

سنبھل کے ٹانکیو ٹانکے زخم دل کو او جراح — یہ حکم ہے کہ رفو دور دور مت کیجو

صفا جو چاہو سو کیجو معاف ہے لیکن — گلہ کسی کا کسی کے حضور مت کیجو

آہ کس سے کہوں ان آنکھوں کی نادانی کو — گھر کیتیں ایک لگا دوڑتے ہیں پانی کو

حسن گفتار نے طوطی کو قفس میں ڈالا — بھاڑ میں ڈالئے کیا ایسی زباں دانی کو

کھچا اک نالہ میں صیاد کو سوئے گلشن — مرحبا مرغ چمن تیرے غزل خوانی کو

ہنسی آتے ہی صفا روئے کس کس غم کو — دل کی نادانی کو یا غم کی فراوانی کو

غنچہ و گل سے غرض کیا مرغ حسرت زاد کو — آنکھ جو کھولے تو دیکھا صورت صیاد کو

ایک نالہ کر دکھاؤں چرخ کج بنیاد کو — کیا کروں یاری نہیں دیتا جگہ فریاد کو

خال سیاہ نہیں ہو اس ابرو کے خم تلے — سیدھے ہلال تھے ہیں طاق حرم تلے[2]

(۵) چندا | اسی دور میں ایک مشہور طوائف ماہ لقا بائی تھی جو نہ صرف موسیقی میں کمال رکھتی تھی بلکہ شعر و شاعری سے بھی خاص دلچسپی رکھتی تھی۔ خود بھی صاحب دیوان تھی۔ چندا تخلص تھا۔ ۱۲۲۶ھ میں اس کا دیوان مرتب ہوا ہے اس دیوان کا ایک نسخہ برٹش

---

[1] دیوان قیس قلمی [2] دیوان صفا قلمی۔

میوزیم انگلنڈ میں بھی موجود ہے۔ کہتی ہے ؎

آتا نہیں ہو خواب میں بھی یار اب تلک
ہیں منتظر کی دیدۂ بیدار اب تلک

سب میکدے میں مست ہیں پر ایک تجھ سوا
دیکھا نہ اسے دور ہیں ہشیار اب تلک

دیکھا رقیب ساتھ تھا گلروکے تب سے رہ
کھٹکی ہے دل میں وہی مرے خار اب تلک

توقع ہے یہی چندا کو ہر دم دین و دنیا میں
نہ بھولیں گے علی والی تجھے امداد سے ہرگز

ساقی دے مجھ کو جام مے ارغوان بھر
افسردہ دل میں آئے جو شعلہ سی جان پھر

مشک سے مطلب نہیں اس کو نہ عنبر سے غرض
ہے جسے صبح و مسا اس زلف دلبر سے غرض

ملتے ہیں توقع پہ تیری غیر سے کم ہم
رکھتی ہیں تیرے دور میں یہ چشم کرم ہم

معروضہ یہ چندا کو نت شاہ نجف سے
دیکھیں نہ کبھو گردش افلاک سے غم ہم

قتل پر کس کے آج ہوی ہے
توسن حسن پر سوار شراب

بنایا یار کی صورت کو وہ نقاش قدرت نے
کھینچے نقشہ نہ ایسا مانی و بہزاد سے ہرگز

چشم کافر بھی ہے اور غمزہ خونخوار بھی ہے
قتل کو پاس سپاہی کے یہ تلوار بھی ہے

ظاہر کی گفتگو کو میرے پاس جا نہیں[۲]
باطن میں ہم تو دل کے سوا آشنا نہیں[۱]

(٦١) محکم روضۃ الشہدا نام ایک منظوم کتاب واقعات کربلا میں لکھی گئی ہے اس کا مصنف محکم دکھنی ہے جس نے ۱۲۳۳ھ میں اس کو تصنیف کیا ہے۔ مختصر نمونہ درج ہے۔

روایت ہے کہ اک دن شاہ امت
نپٹ غمگین تھے بہر شفاعت

سو جبریل امین وسیں آئی
سلام حضرت عزت سنائی

حسین ابن علی کی دیکھ صورت
لگے جبریل رونے بے نہایت

بہن زینب کو تب بلوا کے سرور
لگے رو رو کے کہنے ہائے خواہر

حسن کا خاک میں ملتا ہے اب گھر
چلا قاسم بنا کٹوانے کو سر

مجھے اس بیاہ کی یک آرزو تھی
دولہن دولہا کی سہرا دیکھنے کی

اسے اب خیمہ گاہ میں تم لیجاؤ
مرے قاسم کیتیں نوشہ بنا دو

سیں امڑتا ہے بچا پیاس سے آج
میں بانکی کھڑی ہوں ہو کے محتاج

دہائی تم کو دیتی ہوں ہنی کی
بجھا دو تشنگی اصغر علی کی

---

[۱] دیوان چندا قلمی [۲] کتب خانہ آصفیہ میں قلمی نسخہ موجود ہے۔

مصیبت مجھ بہو پر پڑی ہے ——— مرے اصغر کو اب ہچکی لگی ہے
رہائی شاہ نے جب کچھ نہ پائے ——— یکایک فوج میں گھوڑا چلائے
چلانے جب لگے اعدا پہ تروار ——— ہوی وہاں سیکڑوں لاشوں کی انبار
چلائی تیغ جب وہ شاہ یثرب ——— لگے پھر کانپ نے ارض وسما سب
وہیں ظالم سیہ رو شمر آیا ——— گلے پر شاہ کے خنجر چلایا

(۷) ذکا۔ اسی دور کے شاعر تھے جن کی قابلیت اور لیاقت کے متعلق غالب کے یہ الفاظ ہیں
"یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں کسی امیر کا نہیں کسی شیخ شیا ذکا نہیں۔ یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر دوست کے کلام کو معرض اصلاح میں بہ نظر دشمن دیکھتا پس جب تملق نہیں مدارا نہیں تو جو مجھ کو نظر آتا ہے بے حیف و میل کہوں گا نثر میں نعمت خان عالی کے طرز کا احیا کیا ہے مگر پیرایہ کچھ اس سے بہتر دیا ہے۔ قصاید میں انوری کا چربہ اٹھایا ہے۔ مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز منشی محمد حبیب اللہ صاحب ذکا سخنور ہمہ دان و یکتا لقطہ طراز معنی آفرین آفرین صد آفرین صد ہزار آفرین"
افسوس ہے کہ انکا اردو کلام اب تک جمع نہیں کیا گیا۔ غالب کی ایک درخواست جس کا مطلع
"اے شہنشاہ آسمان اورنگ ——— اے جہاں دار آفتاب آثار
ہے۔ بہت مشہور اور مقبول ہے اسی قسم کی ذکا کی درخواست کے کچھ اشعار نمونتاً پیش کئے جاتے ہیں

اے خداوند کار بندہ نواز ——— فی المثل تو طبیب میں بیمار
ہے جگہ رحم کی ترے آگے ——— گر میں چلاؤں روؤں زار بزار
شعر و انشا کی قدر ایک طرف ——— ہوں میں چودہ برس کا کارگزار
اتنی مدت ہوی مگر نہ ہوا ——— کسی صورت سے ملازم سرکار
یہ سنا تھا مزید نعمت کا ——— عز خدمت پہ ہے جہاں میں مدار
چاہتا ہی رہا کوئی خدمت ——— جس میں در ماہ ہوے بیش قرار
ہے مری ذات میں وہ استعداد ——— کہ نہیں شیوہ میرا استعذار
کونسا کام جو نہ دوں انجام ——— کونسا گھاٹ جو نہ اتروں پار

بس ذکا دیکھی تیری لسانی ——— باادب ہو یہ آصفی دربار[۱]

[۱] رسالہ ترقی مضمون عبدالرزاق صاحب بسمل

غافل کبھی مجھ سے وہ ستمگر نہ ہوا تھا　یعنی کہ میں اندیشۂ محشر نہ ہوا تھا
اچھا کیا پچھلی سے جو رخصت کی سنا دی　مرنے کا مرے وقت مقرر نہ ہوا تھا
نازک تم ایسے ہو تو مجھے کیا امید قتل　ایک کاٹھ کی تو ہاتھ میں تلوار چاہیے
تمام ہو گیا کام اپنا رونے دھونے میں　بہانا تا اشک کا بس موت کا بہانا ہوا
سجدے سے سر اٹھائے تجھے دیکھتے نہیں　بندوں کو اپنے عجز پہ کتنا غرور ہے

ترجمہ رباعیات عمر خیام[1] | راجہ لکھمن لعل نے ۱۲۶۶ھ میں عمر خیام کے رباعیات کا ترجمہ اردو رباعیوں میں کیا ہے۔ صاحب فن خیال کر سکتے ہیں یہ کس قدر دشوار امر تھا مگر راجہ صاحب نے نہایت آسانی کے ساتھ اس میدان کو طے کیا ہے۔ غالباً اردو میں اس طرح کے سب سے پہلے مترجم یہی ہیں دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

"اس نومشق سخن خوشہ چیں ارباب کمال راجہ لکھمن لال کو مدت سے یہ تمنا تھی کہ عند الفرصت اپنے ترجمہ رباعیات فارسی حضرت عمر خیام کا کہ اس بزرگ کے کلام میں سراسر حقیقت اور معرفت تر روشن کرتے ہے خلاصہ اس کا زبان اردو میں موافق اپنے استعداد کے رشتۂ تحریر نظم میں لاوے۔ اگرچہ اس راقم آثم کو اتنا سواد اور مواد زبان ریختہ میں نہیں تھا کہ ترجمہ کلام اس بزرگ کا کما ینبغی کرے لیکن بہ اعتبار اس کے کہ شاید برکت کلام عارفانہ سے اس بزرگ کے کہ فیض ظاہری اور باطنی اس میں متصور ہے اس مترجم کو بھی فائدہ نصیب ہو۔"

رُباعی

جب عشق ہو پستی و بلندی پھر کیا　ہے بیخودی تو ہوشمندی پھر کیا
رکھ طاق میں یار تو مرید پیری　رندی میں خیال ارجمندی پھر کیا

پہلے غم ہجر گرمی محفل تھا　چندے برکات شوق ہم منزل تھا
اے یار اب آکے دیکھ تربت کو مری　یہ مشت غبار کچھ دنوں دل تھا

بجز عشق نہ کھو عزیز اپنی اوقات　زاہد سے نہ کر خراب ایام حیات
نافہمی سے وہ بنا ہے مزار عیب　تو طالب ذلت ہے وہ خواہاں صفات

گزری جو کبھو بہ لطف ساقی یہ عمر　صحبت میں بتوں کے بے نقابی یہ عمر
واللہ نہ پھر رہے گی حسرت دل میں　کاٹیں گی بہ عیش و لطف باقی یہ عمر

---

[1] رسالہ تحفہ مضمون[1] بل[2] کتب خانہ آصفیہ میں قلمی نسخہ موجود ہے۔

کعبہ میں جو بسم مطیع اسلام ہوئے — یا دیر میں ہم حریف اصنام ہوئے
ہے ہی ہمیں کچھ اس کا نتیجہ نہ ملا — بس دیر و حرم میں مفت بدنام ہوئے

مثنوی حیدر زبان[1] | اس مثنوی کو واقف دکنی نے ۱۲۲۷ھ میں فارسی سے ترجمہ کیا ہے میری نظر سے ۱۲۵۸ھ کا لکھا ہوا نسخہ گزرا ہے۔

کرم سے اپنی لے ساقی وحدت — پلا مجکو تو صہبائے محبت
ساقی دے مجھے جام ظہورا — کہ تا دیکھوں خدائے کا ظہورا
ہوا اس کی نشہ سے مست و سرشار — رہوں ہر آن تیرا محو دیدار
مجھے رکھ ہر گھڑی تو مست و مخمور — کہ دیکھوں تا میں تیرا جلوۂ نور
اگرچہ میں بھی تو اہل دکھن ہوں — نہیں کچھ ہند کا صاحب سخن ہوں
ولی ہند سے اپنی حسب مقدور — بیاں کرتا ہوں سنئے اس کا مذکور
قطع فارسی کا میں کیا ہوں — روایت ہر دو قصوں سے لیا ہوں
کہیں بولا حکایت کر زیادی — کیا ہوں اپنی بھی کچھ اوستادی
پس از شکر خدا تاریخ کا فکر — مجھے لازم ہے کرنا اب یہاں ذکر
زمانہ ان کا نو دسال کا ہے — نہیں کچھ آج کل اور حال کا ہے
سنہ ہجری سے دیکھا میں نے فی الحال — تھا بارا سو پہ ستائیسواں سال

دہ مجلس[2] اس دور میں کئی ایک دہ مجلس نواب میر عالم مرحوم کے نام پر لکھی گئی ہیں۔ ایک دہ مجلس کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو ۱۲۳۰ھ میں مرتب ہوئی ہے۔

عجب یہ داستاں ہے غم کی مشکل — کہ بسم اللہ میں بسمل ہوا دل
رواں آنکھوں سے کر لہو جگر کا — لکھوں احوال میں خیر البشر کا
محمد ہے دُر دریائے وحدت — محمد اختر برج نبوت
چلانے جب لگے اعدا پر تروار — ہوی وہاں سینکڑوں لاشوں کی انبار
فرات اوپر گئے سرور کئی بار — نہیں پانی پئی زنہار زنہار
کہے پانی پیوں گر ہو کے بیتاب — تو امت حشر میں ہوگی نہ سیراب
وہ کب پانی پئے زہرا کا جانی — پیا جس کی نہ ہو کیوں ری سے پانی

---

[1] و [2] یہ دونوں کتابیں کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔

ہوی شبیر کو دریا پر جب دیر | تو آکر وہاں لعینوں نے لیا گھیر
چلا لی تیغ جب وہ شاہ یثرب | لگے پر کانپ نے ارض وسماسب
غرض انیس سو پنجاہ سوار | کٹی شمشیر سے جب داخل النار
در آیا جب تک ایک زخم تن پر | کھڑا تھا شیر غراں شاد آن پر
یہ ہوے میر عالم پر عنایت | شفا دنیا میں عقبیٰ میں شفاعت

مثنوی جنگ نامہ امیر حمزہ[لہ] ایک اور مثنوی جنگ نامہ امیر حمزہ کے نام سے ۱۲۵۷ھ میں لکھی گئی ہی اس کے مصنف سید قربان حسن حاجی ہیں نمونہ ملاحظہ ہو۔

شہنشاہ کی بیٹی تھی اس بھار | اتھا نام اسے جگ میں مہر نگار
امیر کے شجاعت کو سن جگ نے | اتھی بہت حمزہ پو عاشق انے
کہتی تھی ایک آدمی سوں یک ماجرا | اتھا نام اس کا جو خواجہ سرا
اسے دیکھ حمزہ کو اس حوض پر | کیا شاہ زادی کو جلا دنے خبر

دور ثانی کی نثر

دور ثانی کی نظم کا نمونہ گزر چکا اب نثر کا نمونہ پیش کیا جاتا ہی اس دور میں ہر فن کی کتابیں تصنیف اور تالیف ہونے لگیں۔ علوم وفنون نثر کا جامہ پہننے لگے۔ تفسیر تاریخ فلسفہ قصص غرض ہر فن میں متعدد کتابیں مرتب ہوی ہیں۔ اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہی کہ انگریزی زبان سے فنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہونے لگا۔ جس طرح شاعری کی ابتدا دکن سے ہوی اسی طرح یہ امر بھی دکن کے لئے باعث افتخار ہی کہ فنون کی کتابوں کے ترجمہ سے اپنی زبان کو مالا مال کرنے کا قاعدہ جاری کیا گیا۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ قومی ترقی کے وقت ادبیات کے میدان میں اس کا پہلا قدم ترجمہ کی منزل ہی ہوتا ہے اور جب یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں وسیع اضافہ کرتے ہیں تو قوم میں ایک نئی حرکت پیدا ہوتی ہے اور تالیف وتصنیف کی صورت حاصل ہو جاتی ہے غرضکہ اردو زبان کی ترقی کا یہ ایک بہترین کارنامہ ہی جو اپنے بانی کا نام زندۂ جاوید رکھے گا۔

لہ کتب خانہ آصفیہ میں نسخہ موجود ہی ۱۲

امیر کبیر محمد فخر الدین خاں شمس الامرا ثانی کو (جو خاندان پائگاہ کے چشم و چراغ تھے) علم و فن سے خاص دلچسپی تھی۔ علم ہئیت ہندسہ و فلسفہ کا خصوصیت کے ساتھ شوق تھا۔ اسی ذوق و شوق نے انگریزی کتب کی جانب توجہ مبذول کرائی۔ چنانچہ ستہ شمسیہ نام چھ رسالے ترجمہ کئے گئے یہ رسالے ۱۲۵۳ھ میں طبع ہوے ہیں اب ہم مختصر طور پر اس کی عبارت نقل کرتے ہیں تاکہ اس وقت کی نثر کا اندازہ ہوسکے۔

ستہ شمسیہ[1] دیباچہ یوں شروع کیا گیا ہے۔

"نیاز مند درگاہ ایزدی کا محمد فخر الدین خاں المخاطب شمس الامرا اس طور پر گزارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہیں بہ سبب میلان طبیعت کے نسبت اس طرف شوق رکھتا تھا میری سماعت میں آئیں اسی جہت سے چند مسائل اُن کے از بر تھے اور اگرچہ بعضے علوم فلاسفہ زبان عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں چنانچہ علم جر ثقیل اور علم انظار وغیرہ مگر اس قدر سستی نہیں کہ جیسا اب اہل فرنگ نے ان کو دلایل اور براہین سے بدرجہ کمال اثبات کیا ہے۔ بلکہ بعضی علوم اہل فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کا نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا چنانچہ علم آب اور ہوا اور زبر فک اور مقناطیس اور کیمستری وغیرہ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدہ کے لئے ایسی کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصت قلیل میں اس کے معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہووے کس واسطے کہ اگر بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالبوں کے ذہن پر اس کے مطالعہ کا بار ہوگا اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے اُن کی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی۔ پھر طالبین از خود ارادہ مبسوط کتابوں کے دیکھنے کا کرلیں گے۔ چنانچہ ان دن میں بہ حسب مدعا چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بطریق سوال وجواب کے لکھے ہوے ریودی رنٹ چالس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۸ء میں بیچ شہر لنڈن کے چھاپے گئے تھے بہم پہونچے۔"

کشش ثقل کے بیان میں"

"استاذ۔ اب میں نے ارادہ کیا ہے کہ تم کو کیفیت و حقیقت سے کلیہ عمدہ کی آگاہ کروں

---

[1] یہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے ۱۲

جس کو کشش ثقل کہتے ہیں اور وہ ایک قوت ہے جس کے سبب اجسام بعیدہ باہمدیگر تجاذب
رکھتے ہیں اور یہ امر ظاہر ہے گرنے سے تمام اجسام ثقیلہ کے زمین پر"

"تلمیذ کلاں۔ گولی کا ہاتھ سے گرنا اور اینٹ کا چھت سے ساقط ہونا اور سیب کا جھاڑ سے
زمین پر آنا یہ سب کیا سبب اسی قوت کے ہیں؟"

"استاذ۔ ہاں یہ سبب اسی قوت کے ہیں جس کو ثقل تعبیر کرتے ہیں پس وہ اجسام
جن میں کچھ بھی میل ہے۔ اگر ان کو کوئی تھامنے والا نہ ہو تو سطح زمین پر قریب عمود وار گریں گے
اور اس میل کو جو نتیجہ اور حاصل ثقل ہے جسم کے اجزا ہے وزن کہتے ہیں یہیں سے ہے کہ ثقل اور
وزن متفاوت ہیں کیونکہ وزن ایک جسم معین کا واسطے ناپنے وزن دوسرے جسم کے استعمال
نہیں لاتے ہیں جیسا وزن سنگ ترازو کا تھا بر امتحان وزن غلے وغیرہ کے استعمال کرتے ہیں"

مندرجۂ بالا اقتباسات سے نہ صرف اس امر کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ اس وقت کی زبان
کا کیا انداز تھا بلکہ سائنس کے متعلق ترجمہ کی کوشش باوجود اصطلاحات کی دشواری کے ظاہر ہوتی ہے

رسالۂ اعمال کرہ | یہ کتاب بھی امیر کبیر کے اہتمام سے ترجمہ ہوئی ہے مگر ترجمہ نے تالیف کی صورت
اختیار کر لی ہے اس میں جغرافیہ اور ہیئت کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ سنہ ۱۸۴۲ء میں یہ کتاب
طبع ہوئی ہے۔ چار باب میں کتاب منقسم ہے۔ پہلے مقالہ میں تعریفات۔ دوسرے میں جغرافیہ
تیسرے اور چوتھے میں ہیئت سے بحث کی گئی ہے عبارت کا نمونہ درج ذیل ہے:-

"قطبین عالم وے دو طرفین محور کی ہیں کہ جہاں زمین کی سطح نے اس محور کو قطع
کیا ہے ان میں سے ایک قطب شمالی ہے اور دوسرا قطب جنوبی اور مقابل ان ہی
دو نقطوں کی آسمان کے دو قطب واقع ہیں۔"

"سوال۔ جون کی دسویں کو آفتاب کون کون مقام میں عمود وار رہتا ہے اور کون
کون مقام میں طلوع اور غروب نہیں ہوتا۔"

مجواب۔ سندیلہ اور کلکتہ اور آوا اور مکا اور جزیرہ چین وغیرہ میں آفتاب عمود وار
رہتا ہے اور منطقۂ مبردۂ شمالی میں مکنزئی اور گرین ندید اور کیپ میں غروب
نہیں ہوتا اور منطقۂ مبردۂ جنوبی میں اس جگہ کہ جہاں تمام بحور ہیں طلوع نہیں کرتا"

"انیسواں زلزلہ سنہ ۱۸۶۸ء میں شہر کلوا جو پیرو کے ملک سے متعلق ہے اور اس
شہر میں پانچ ہزار سپاہی سکونت کرتے تھے اسی طرح سے ہوا تھا کہ ناگاہ وہاں

کی زمین صدمہ کھانے لگی جو لوگ سوتے تھے ون کو زمین کا صدمہ معلوم ہوا اٹھنے نہیں پائے کہ دریا اس طغیانی سے بلند ہوا کہ اس کی موجیں اس شہر پر سے گزریں تمام آبادی ڈوب گئی"

"زحل کا بیان۔ یہ سیارہ مدھم روشنی سے نظر آتا ہے اور آفتاب سے بہت دور ہے اور باستعانت بہتر آلہ دوربین کے اہل علم کو اس سیارے کی پیٹی کے دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے اور یہ پیٹی اس سیارے کی اطراف بتمامہ ایک حلقہ روشن ہے اور اس حلقہ کے باہر سات قمر گردش کرتے ہیں اور ان اقمار میں سے ایک قمر اس حلقے کی سطح پر حرکت کرتا ہے"

<u>انوار سہیلی</u>[1] | یہ بھی عجیب مقبول عالم کتاب ہے۔ دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ دکن میں بھی ۱۲۴۲ھ ۱۸۲۶ء میں یہ کتاب دکنی زبان میں طبع ہوی ہے۔ یہ کتاب ستہ شمسیہ کے پہلے کی ہے اس کی زبان بھی پیش کی جاتی ہے؛

"جب میں نے اپنا عجز و انکسار بتلایا تب حضرت دل سے خطاب مستطاب ہوا کہ اے میاں محمد ابراہیم بن ملک حسین خاں بن شیخ محمد بیجاپوری جمعدار دکھنی ہزار سواری تو نے کہا کہ اگر کسو نے مجھ سا فقیر زماں اور کثیف دوراں اس جہاں بے پایاں میں بغور تمام ملاحظہ کیجئے تو بھی اس کا دست ارادت دامن مقصود تک نہ پہنچے اور غنچہ مطلب رستہ امید کو نہ اینچے"

"چین کے ملک کے اور س چو رس میں ایک بڑا بادشاہ تھا اس کا نام ہمایوں فال ہور اسے ایک بڑا بیکا وزیر تھا اس کا نام خجستہ رائے ہمایوں فال ایک بار خجستہ رائے کو سات لے کر شکار کو گیا وہاں سوں الٹتے تو دھوپ پڑی تھی ایک پہاڑ کی انی پو جھاڑاں تھے۔ چھاؤں کی خاطر خجستہ رائے کو سات لے کر اس چھاؤں کے تلے جا بیٹھا ہور دیکھا تو کیا کہ ایک جھاڑ اس کا کھوڑ کا ہور بڑا ہو گیا ہے اس کے اندر شہد کے مکھیاں پوتی بندتے اندر گھستے اور بہار نکلتے ہیں۔ ہمایوں فال خجستہ رائے سوں پوچھا یہ کیا ہونگا انے بولیا یہ شہد کی پوتی ہے۔ بادشاہی عملاً فعلاً سگل ان کے ہاں ہے۔ جمشید نے بادشاہی کرنا ان ہوچ سیکھیا ہمایوں

---

[1] کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے ۱۲

قال بولیا ارے میاں وزیر دنیا بڑی کھٹ کھٹ کی ہے اس سوں بہتر ہے کہ سب چھوڑ دیکر کو ناپکڑنا۔ خجستہ رائے بولیا تمھارے سوں عالم کا بھلا ہوتا ہے تمنا کو پکڑنا کو کیا نفع۔ عدالت سوں بادشاہی کرے تو دنیا میں حور دین میں دونو جگہ بھلائی ہے۔" قطعہ

خاک کو حور گگن کو تم دیکھو — اس کو آرام ہے سی اس کو سفر
مال دولت سفر سوں ملتی ہے — اور ملتا ہے لی سفر سیں ہنر
جھاڑ چلتا تو اپنی جاگہ سین — اوسے کا جور اُس پر حور نہ تیر

بائیکو بھی بولی سو یہ بات سچ ہے۔ جس کا حق اسے دے ڈالنا اچھا ہے حور خدا پر بھروسا رکھنا سوں بھلا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ ھمنا دیگا۔ نظم

جدھاں جس کی تقصیر توں پائے گا — صبر اسوں عذاب اس کو پہچائے گا

"..."

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ دور اول کے اکثر الفاظ استعمال کئے گئے ہیں مثلاً

سوں — سے ، لو — پر ، بھار — باہر
کسونے — کسی نے ، تلے — نیچے ، انُنے — اس نے
انی — چوٹی ، حور — اور ، بولیا — کہا

مصباح الصلوٰۃ[1] مولوی قادر علی نے اس نام سے ایک کتاب ترجمہ کی ہے جو ۱۲۳۲ھ کی تحریر اور فقہ حنفی کے متعلق لکھی گئی ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"انسان بالغ پر جاننا فرض کا فرض ہے اور جاننا واجب کا واجب ہے اور جاننا سنت کا سنت ہے اور جاننا مستحب کا مستحب ہے۔
.... صاحب مفتاح الصلوٰۃ معتبر کتابوں سے لکھا ہے جو شخص کہ فرائض اور واجبات نماز کی نہیں جانتا ہے نماز اس کی روا نہیں ہے شیخ ابو حفص کبیر فرمائے کافر ہووے نعوذ باللہ منہا"
"رکھنا ہاتھوں کا نیچے ناف کی سنت ہے۔ کیفیت اس کی یہ ہے کہ منکٹ کو یادیں ہات کی سیدھے ہات کی انگوٹھی اور کن انگلی سی پکڑ لیوے اور تین انگلیاں اپر

[1] کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے ۱۲

منکٹ کی رکھے اور باطن سیدھے لات کا اپر ظاہر یاد یں لات کی لادی"۔

تفسیر غوثی یہ پارہ عم کی تفسیر ہے جس کے مصنف مولانا غوثی دکھنی ہیں افسوس ہی کہ سنہ تصنیف کا پتہ نہیں چلا۔ قیاس سے معلوم ہوتا ہی کہ اسی دور ثانی کی یادگار ہی۔ تفسیر کا طریقہ اس طرح کا ہی کہ اولاً آیت، کی شان نزول لکھتے ہیں پھر ایک آیت لکھ کر اس کے معنی واضح کیے جاتے ہیں۔ مثلاً "عم یتساءلون" اس آیت کا شان نزول یہ ہی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو قرآن کے حکم ظاہر کرنے لگے اور حشر کے روز سے ڈرانے لگے تب کافراں مسلمانوں سے پوچھے کہ یہ بات تحقیق ہی تب یہ آیت نازل ہوی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کافراں کیا سوال کرتے ہیں عن النبإ العظیم الذی ھم فیہ مختلفون اللہ تعالیٰ فرمایا ہی کہ وے کافراں بڑی چیز پوچھتے ہیں لیکن اس چیز میں وہ کافراں اختلاف کرتے ہیں۔ تفسیر والے لکھتے ہیں کہ بعضی تفسیر میں ہی کہ کافراں قرآن میں اختلاف کرتے ہیں یا نبوت میں اختلاف کرتے ہیں اور بعضی کافراں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جادوگر بولتے ہیں اور بعضی کافراں شاعر بولتے ہیں کہ حشر نہیں ہی اور بعضی کافراں بولتے ہیں کہ حشر برحق ہے کہ ہماری بتاں حشر کے روز ہم کو چھوڑاینگے۔

کلا سیعلمون ثم کلا سیعلمون اللہ فرماتا ہی کہ تحقیق وہ کافراں اس روز کون جلد معلوم کریں گے اور جس روز کو کافراں اختلاف کرتے ہیں یعنی حشر کے روز کون جلد دیکھینگے تحقیق معلوم کریں گے اور جلد معلوم کریں گے۔

مثل اور کتابوں کے یائے معروف و مجہول کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔

تفسیر واحدی ملا واحدی نے پارہ عم کی تفسیر لکھی ہی لیکن اس کو بجائے تفسیر کے ترجمہ کہنا زیادہ مناسب ہی کیونکہ انھوں نے تقریباً ترجمہ ہی کیا ہے۔

"انا اعطیناک الکوثر یعنی تحقیق دیا ہم نے تم کو بہت سی چیز علم اور عمل سے بہت سی معجزوں سے اور بہت سے دوستی سے اور ندی سے جو بہشت میں ہے فصل لربک وانحر یعنی پس نماز پڑھو اپنے رب کی اور قربانی کرا سکے واسطے ان شانئک ھو الابتر یعنی تحقیق دشمن تمہارا عاصی وہی ہے۔ مقطوع النسل"

اوالہ کتب خانہ آصفیہ میں نسخہ موجود ہی ۱۲

لازم الاسلام | محمد عثمان صاحب مبین نے اس نام سے ایک کتاب فقہ میں لکھی ہے جو ۱۲۶۱ھ میں مرتب ہوئی ہے سب سے پہلے وحدت الوجود کے متعلق بحث کی ہے جس کا نمونہ درج ہے۔

"جان کہ اے دوست تمام عالم میں نظر کرو تو خلق کئے کئے طرح کا ہے جو حدیث میں آیا ہے عالم اٹھارہ ہزار طرح کا ہے بالفعل عالم دنیا کو دیکھو تو کوئی عاجز ہے اور کوئی مختار ہے اور کوئی قابل ہے اور کوئی نابکار ہے کوئی نیک ہے اور کوئی بد ہے اور کوئی بدشکل ہے اور کوئی خوش قد ہے پس معلوم ہوا کہ ہر سبب اپنے ہوتے ہیں آپ ہی مختار ہوتے تو سب لوگ خوب وخوش اور نیک ہوتے جو پسند خاطر ہر ایک ہے یہاں یقین یہ ہوا ہے کہ پیدا کرنے ہارا ان کا کوئی جدا ہے کہ ان کی انکی قابلیت کے موافق پیدا کیا جیسا کہ کمہار مٹی سے طرح طرح کے باسن قابلیت پہ ہر ایک ظاہر کیا کرتا ہے پس جان تو پیدا کرنے ہارا سب عالم کا شاید دوسرا کوئی ہے"

تاریخ رشید الدین خانی[1] یہ ایک ضخیم تاریخ ہے جس کو امام خاں نے شمس الامرا امیر کبیر ثالث کے حکم سے مرتب کیا ہے ۱۲۸۰ھ میں طبع ہوئی ہے یہ کتاب بڑی سائز کے ۹۰۱ صفحات پر مشتمل ہے ایک مقدمہ تین دفتر اور خاتمہ پر کتاب کو تقسیم کیا ہے مقدمہ میں راجہ گان ہند کے حالات دفتر اول میں سلاطین دہلی کے حالات دوسرے دفتر میں اسلامی سلاطین دکن کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے دفتر میں مشاہیر کے حالات مندرج ہیں اس دور کے آخر انگریزوں کا دکن میں آنا اور حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے جنگ کے مفصل واقعات بیان کئے ہیں۔ اگرچہ کتاب ۱۲۸۰ھ میں طبع ہوئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھی چنانچہ بہادر شاہ کے حال میں لکھا ہے "سلطنت دہلی کو بہادر شاہ وقت کے جلوس سے ان اوراق کے تحریر تک کہ آخر ذی حجہ ۱۲۳۵ھ ہے سولہ برس چھ مہینہ پچیس دن ہوتے ہیں"

اس تاریخ کی عبارت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ آصف جاہ اول کے ذکر میں لکھتے ہیں

"نواب چونکہ بہ نفس نفیس جمیع مقدمات مالی اور ملکی کا انصرام فرماتے تھے مگر بعضی ندمانے فی الجملہ ان کے آرام کا خیال کر کے ایک معتمد علیہ مقرر کرانے کیلئے عرض کیا نواب نے خدمت دیوانی کے لئے امرا کبار میں سے ایک معتمد علیہ

---

[1] مشہور کتاب کتب خانہ آصفیہ میں بھی موجود ہے۔

متدین کو تجویز کرکے جن کا نام راقم کو تحقیق نہیں ہوا اس عہدہ کا مژدہ انکو پہنچایا محمد ابوالخیر خاں بہادر جو ایک دوراندیش شخص اور خیر خواہ سرکار تھے انھوں نے اس کو نامناسب جانا اور شب کے وقت جس کی صبح کو کار خدمت ان کے سپرد ہونے والا تھا ابوالخیر خاں در دولت پر حاضر ہوئے اور نواب کو اطلاع کرائی نواب باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ "نا وقت آنے کا کیا سبب ہے؟ عرض کیا جناب والا کل دیوان کیا چاہتے ہیں میں اس بات کا خیال کرتا ہوں شاہ جہاں آباد میں جب بادشاہ سلامت کو اس تقرری کا علم ہوگا تو وہ یقین کرینگے آصف جاہ کبیر سنی کی وجہ سے آرام طلب ہوگئے ہیں اور یہ بات نامناسب ہوگی تو نواب نے فرمایا میں تو حکم دے چکا ہوں ابوالخیر خاں نے عرض کیا کچھ مضائقہ نہیں ہے دربار کے وقت بجائے عرض بیگی کے بندہ کو اعلام کا حکم ہو فدوی اس وقت کچھ حکمت عملی کر گزریگا۔ صبح کو جب اعلام کا حکم خاں موصوف کے لئے ہوا تو خان موصوف نے اس معتمد علیہ کا نام زبان فارسی میں ندا کی کہ از خدمت صوبہ داری برہان پور فلاں شخص سرفرازی یافت ہر چند ناواقف لوگ معہ خدام کے کہتے رہے نہیں اعلام دیوانی کا حکم ہے مگر چوبداران حسب ایما خان موصوف جلد مجرا ادا کردیا اور نذر پیش کرادی۔"

اس دفتر کو غفراں منزل نواب ناصر الدولہ کے حالات پر اس طرح ختم کرتے ہیں :-

"واضح ہو کہ سنہ جلوس سے ۱۲۶۹ھ کے اسی ماہ کے آخر تک نواب صاحب کی مدت سلطنت (۲۵) سال ایک ماہ گیارہ روز ہوتی ہے سن حضرت کا (۵۱) سال کا ہے۔"

تذکرہ وانوار بدریہ | جیسا کہ معلوم ہوچکا ہے شمس الامرا امیر کبیر ثالث ایک علم دوست امیر تھے آپ کے علمی کارنامے آج تک زندہ ہیں۔ نواب صاحب کو علم ریاضی سے خاص شغف تھا اور اس میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ یہی شوق ان کتابوں کی تصنیف کا باعث ہوا۔ یہ دونوں کتابیں ریاضی سے متعلق ۱۲۵۸ھ میں مرتب ہوئی ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے :-

تذکرہ "ایک روز جناب اقتدار مآب اقتدار الملک اقتدار الدولہ محمد رشید الدین خاں

---

[1] یہ دونوں کتابیں بھی کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں ۱۲

نواب امیر کبیر شمس الامرا نے ایسا فرمایا کہ علم ہندسہ میں کوئی نسخہ ایسا نہیں کہ جس کی تعلیم سے مبتدیوں کو فی الجملہ بصیرت حاصل ہو اور پائے شوق دراز اگر کوئی لکھے تو کیا بہتر ہے اور یادگار زمانہ نظر بریں اس ذرہ بے مقدار شاہ علی متوطن قلعہ ادھونی نے چند اشکال ہندسی کو اس مختصر میں جمع کر کے موسوم بہ تذکرہ پیش کیا۔"

تعریف علم ہندسہ

"علم ہندسہ وہ علم ہی کہ اس میں بحث ہو احوال مقادیر ثلثہ سے یعنی خط و سطح و جسم تعلیمی کہ مشترک ہیں متصلہ قار الذات میں جو ان کی جنس ہے بلکہ موضوع بھی اس علم کا اور یقینیات کو پہونچا یا جلی دینا۔

اس رسالہ میں اقلیدس کے (۴۸) شکلیں ثابت کی گئی ہیں۔

انوار بدریہ

"جانا چاہئے کہ وے نسبتیں جو اقلیدس میں مذکور ہیں اگرچہ کثیرۃ فوائد ہیں بہتر از شکل عروس ہیں لیکن معانی میں باوجود نزاکت ایسی قلیل ان کا الفاظ کہ جن کا سمجھنا مبتدیوں کو بنہایت دشوار بلکہ منتہیوں کو بھی اس لئے ان کو اس ذرہ بے مقدار شاہ علی ساکن قلعہ ادھونی نے زبان ہندی میں بعبارت سلیس معہ امثلہ عددی ترجمہ کیا۔"

تعریف نسبت مساوات

"مقادیر دو نصف کی جو مراتب میں برابر اور نسبت میں ایسے ہوں کہ دو مقدار میں ایک صفت کے وہ نسبتہ ہو جو ہر دو مقدار میں صفت آخر کی ہو۔ پس اطراف ہر صفت کے نسبت دینے کو اوساط نسبت مساوات کہتے ہیں۔"

تاریخ خورشید جاہی[1] شمس الامرا نواب رشید الدین خاں امیر کبیر ثالث کے فرزند تیغ جنگ نواب محی الدین خاں سر خورشید جاہ امیر کبیر رابع بھی اپنے والد ماجد کی طرح علم دوست تھے۔ آپ کے حکم کی بنا پر غلام امام خاں نے تاریخ خورشید جاہی مرتب کی۔ گویا اسے تاریخ رشید الدین خانی کا تتمہ کہنا چاہئے۔ اگرچہ اس کی ترتیب جداگانہ ہی

---

[1] کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

کیونکہ بجائے سلاطین کے حالات کے صوبہ کے حالات اور ان کے فتوحات کا ذکر ہے اس کے علاوہ اولیاء اللہ اور شاہان ایران وغیرہ کے سوانحات بھی شامل کر دئے گئے ہیں۔ چہار دہ سالہ کیفیت کا من ابتدائے سنہ ۱۲۷۱ھ لغایۃ سنہ ۱۲۸۵ھ مفصل بیان ہے۔ غرض بہ حیثیت مجموعی ایک جداگانہ تاریخ ہے۔ مقدمہ میں علم تاریخ کے فواید بیان کئے گئے ہیں:۔

"ہر شخص کے لئے اشیاء دریافت کرنے کے دو ذریعہ ہیں۔ عقل و حواس خمسہ [illegible] کا علم دیکھنے سے بھی ہوتا ہے اور سننے سے بھی۔ اور ہر ایک ہوشمند جانتا ہے کہ اس عالم کے تمام حالات محض عقل سے بخوبی معلوم نہیں ہو سکتے۔ اور یہ امر ناممکن ہے کہ ایک شخص ابتدائے عالم سے آخر تک تمام واقعات اور حالات معلوم کرنے کا کوئی عمدہ ذریعہ اس کے سوا نہیں ہے کہ علم تاریخ میں بخوبی غور و خوض کیا جائے۔

اس علم کے ذریعہ انسانی طبع میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور آئینہ دل سے ملال کی کدورت رفع ہو جاتی ہے۔ گزشتہ زمانہ کے لوگوں پر جو جو واقعات گزرے ہیں اس سے واقفیت حاصل کی جاتی ہے۔ ان کے زوال و اقبال کے اسباب دریافت کئے جاتے ہیں۔"

اس کے بعد مورخ کے اوصاف ظاہر کئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اس کو تعصب سے پاک اور واقعات بے کم و کاست بیان کرنا ضروری ہے مدح و ذم میں افراط و تفریط نہ کرنا چاہئے بلکہ خیر الامور اوسطہا پر عمل کرنا چاہئے۔ طرز عبارت سلیس تکلفات سے منزہ سہل المآخذ قریب الفہم ہونا چاہئے۔ مورخ کو ضروری ہے کہ دیانت آثار و امانت شعار ہو اس کا کلام سراپا صداقت ہو۔ اس کے افعال میں راستبازی ہو واقعات میں عموماً اور حالات سلاطین میں خصوصاً اس کے بیان پر لوگ پورا اعتماد کر سکیں

جیسا کہ میں نے قبل ازیں لکھا ہے کہ صوبہ جات کے حالات سے واقعات بیان کئے گئے ہیں صوبہ جات ہند کو (۲۱) صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے صوبہ کا محاصل مخارج ذکر کیا گیا ہے پھر اس کے متعلق مفصل کیفیت قلم بند کی گئی ہے مثلاً صوبہ خجستہ بنیاد کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:۔

"اس صوبہ کو ملک مرہٹہ کہتے ہیں پس زمانہ میں نظام شاہیہ کے صوبہ احمد نگر قرار پایا صاحب نسخہ جدید لکھا ہے کہ زمانہ سابق میں نام اس کا دیوگڈہ تھا اور عہد میں راجہ بھوج کے دہارا کہا کرتے تھے۔ جب فخر الدین جونا شاہ شاہ دہلی نے تمام دکن پر قبضہ کیا تو قلعہ دیوگڈہ کا نام دولت آباد رکھا اور دار السلطنت اپنا فرمایا۔ بعدہ جب نوبت فتوحات دکن کی اورنگ زیب عالمگیر کو پہونچی نزدیک ہمایون موضع کھڑکی میں

سنہ ۱۰۶۵ھ میں ایک شہر کمال لطافت و استحکام کے ساتھ آباد کر کے نام اس کا خجستہ بنیاد اورنگ آباد رکھا۔ وہاں میوہ ہر قسم کا ہوتا ہے۔ مگر نیشکر کمال نازک اور شیریں اور بزرگ ہوتا ہے اور کیلا اور ناریل اور کیوڑا اور پان اور ترنج بکثرت ہیں۔ واضح ہو کہ دولت آباد ایک سنگ ہے۔ تراشیدہ سر بفلک کشیدہ اور اس کو ایسا تراشا ہے کہ اس کی صفائی سے پاؤں پھسلتے ہیں ارتفاع اس کا (۱۴۰) گز ہے خندق اس کی عمیق تیس گز ہے سنگ خارا میں پانی پہنچا ہے کسی نے تعریف میں کہا ہے؎

حصارے کہ مثلش ندیدہ ست کس بود قلعہ دولت آباد و بس"

اس کے بعد اولیاء اللہ کے حالات قلم بند کئے گئے ہیں۔ جن میں سید حسین خنگ سوار، خواجہ معین الدین اجمیری شیخ نجم الدین سیناتی۔ قاضی حمید الدین ناگوری۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز شیخ سراج الدین جنیدی شیخ برہان الدین دولت آبادی وغیرہم کے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس ذکر کے بعد امیر تیمور سے حالات شروع کئے گئے اور اس کے ختم پر امرائے دربار دکن کے حالات لکھے گئے ہیں نمونہ ملاحظہ ہو۔

"شیخ حسین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان۔ آپ باب بزرگ تھے۔ مزاج میں نہایت زہد و تقویٰ تھا۔ مرید شیخ کبیر کے ولایت گجرات میں مدت تک خدمت میں بسر کئے۔ پھر علوم کسبی و دینی تحصیل کر کے وطن اصلی کو پھر آئے۔ سالہا مجاہدہ کیا برسوں مجاور قبر شریف خواجہ معین الدین رہے ایک تفسیر قرآن شریف کی اور کئی رسالہ اور مکتوبات تصنیف ہوئی ہیں"

ابوالخیر خاں تیغ جنگ کا حال یوں قلم بند ہوا ہے۔

"ان کا مولد بلدۂ برہان پور ہے۔ آپ اول اپنے والد بزرگوار کے جاگیر موضع لاڑشاگر نام میں مدت تک خانہ نشین اور قناعت گزیں رہے اکثر اوقات اپنے ہم نشینوں کے سامنے بیان کیا کرتے کہ جس قدر مجھ کو دولت کی ترقی ہو گی اسی قدر اپنی فوج کے ساتھ سلوک زیادہ کروں گا۔ چونکہ ان کی نیت بخیر تھی ایسا ہی ہوا جس وقت نواب سنہ ۱۱۳۲ھ میں رونق افزائے بلدۂ برہان پور ہوئے اور ہمراہ رکاب ان عالیجناب کے ہوئے جب رکن الدولہ کا انتقال ہوا تو چونکہ حضور فیض گنجور میں کوئی معتمد علیہ نہیں تھا تو حضرت نے چند روز تک کسی کو دیوان مقرر نہ رکھا اور تمام امورات کلی و جزئی کا خود ہی انجام دیتے رہے۔"

اسی دور میں رسائل کی اجرائی عمل میں آئی چنانچہ ۱۲۸۵ھ میں رسالہ طبابت جاری ہوا یہ ایک طبی رسالہ تھا جس میں یونانی اور ڈاکٹری مضامین اردو میں شایع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ مدرسہ طبیہ کی زیر نگرانی شایع ہوا کرتا تھا۔ اس طبی رسالہ میں مریضوں پر عمل جراحی کرنے اور ان کے اس سے صحت یاب ہونے کے رپورٹیں اور مفید طبی معلومات وغیرہ شایع ہوتے تھے۔ نمونہ کی عبارت حسب ذیل ہے:-

"ایک عورت قوم سے اہل اسلام کے کہ عمر اس کی قریب پچیس سال کی ساکن قصبہ بیڑ کی نام اس کا پاپا بی غرہ شہر شوال المکرم ۱۲۷۷ ہجری کو نزدیک اس فدوی کے آئی اور ایسا بیان کی کہ یہ رسولی مجھے تین سال سے ہے اور دن بدن ترقی پر ہے۔ القصہ اس فدوی نے اول اس بیمارہ کو بے ہوش کر کے یومرل آٹری ٹرنکٹ سے باندھ کر ایک اسکیاپل سے بیضاوی شکل کی مانند چیر کر پوست کو تشریح کر اس رسولی کو امانت نکال لیا اور ذرا بھی مادہ اس رسولی کا نہ رہنے دیا بعد از آٹری وغیرہ کو باندھ کر لب زخم کو ملا کر ٹانکے دے کر اڈہی زف پلاسٹر کے تسمے لگا دیا اور انٹی فلوجسٹک رجمنٹ کے حال پر رکھا۔ چند روزہ میں عنایت الٰہی سے وہ بیمارہ درست ہو گئی اور وہ رسولی دو اونس چار ڈرام تھی۔ (فلیمنگ)

فاسفیور ہیڈروجن۔ یہ بھی بے رنگ اور شفاف گاس ہی اور حیوانی مادوں کی سڑاوٹ سے پیدا ہوتا اور اس کی بو ایسی ہی کہ جیسا کہ بوسیدہ مچھلی کی بو ہی یہ گاس بھی انسان کی جان کو اور صحت کو بہت مضر ہے اور اہل کیمیا اس کو ایسی پاکی سے تیار کر سکتے ہیں کہ تیار ہوتے ہی فوراً سلگ کر جل جاتا ہے"[1]

رسالہ مخزن الفواید | مولوی سید حسین بلگرامی نواب عماد الملک بہادر نے سال ۱۲۹۰ھ میں اس نام سے ایک رسالہ[2] شایع فرمایا تھا جو علمی و اخلاقی مضامین پر مشتمل تھا۔ تاریخ۔ فلسفہ۔ سائینس ادب و اخلاق وغیرہ کے اچھے اچھے مضمون شایع ہوتے تھے۔ اس کے مضمون نگار نواب محسن الملک۔ نواب سرور جنگ وغیرہ اصحاب تھے۔ رسالہ جلد اول نمبر ۹ ماہ ذیحجہ ۱۲۹۱ ہجری[3] کے مضامین کی فہرست نموناً درج کی جاتی ہے:-

مضمون	مضمون نگار
حفظ صحت	سید باقر علی خاں بہادر
پانی اور ہوا کا بیان	مولف (سید حسین بلگرامی)

---

[1] بستان آصفی [2] رسالہ جلد ۲ نمبر ۱ ماہ صفر ۱۲۸۵ھ [3] جلد نہم ماہ رجب ۱۲۷۹ ہجری

اردوئے معلا	مرزا قربان بیگ سالک
امام مہدی جعلی	مشتاق حسین
داستان دہم نیرنگ زمانہ	آغا مرزا بیگ
سلطنت اسلامیہ	سید مہدی علی

یہ رسالہ سرکاری دار الطبع میں شایع ہوا کرتا تھا مضامین کا انتخاب نمونہ کے طور پر درج ہی:-

"بیراگمان ہی کہ یہ زبان ابتدا ہی میں اچھی طرح مروج ہو جاتی مگر خاص لوگوں کی اس کی طرف توجہ نہ ہوی فقط لشکری لوگ اس کے محتاج الیہ رہے بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ زبان اکبر کے زمانہ میں نکلی - بعض جہانگیر کے لشکر کو اس کا ماخذ قرار دیتے ہیں - ظفر صاحب نے تاریخوں سے لے کر شاہ جہاں کا زمانہ لکھا ہی - شکسپیر صاحب اور آلیٹ صاحب سکریٹر نے اپنی اپنی تالیفات میں اکبر سے پہلے ثابت کیا ہی - بعض یہ کہتے ہیں کہ اردو زبان عجمیوں کی نکالی ہوی ہے - یہ بھی غلط معلوم ہوتا ہی کہ اس لئے کہ لشکر کل میں تنہا عجم ہی نہ تھے - ہاں یہ ہو سکتا ہی کہ پہلے یہ طریقہ عجمیوں نے نکالا - اپنی زبان میں عربی کی لفظ اور جملہ ملائے - اس صورت میں عجمی لوگ اس طریقے کے موجد ہو سکتے ہیں نہ زبان اردو کے" (اردوئے معلا - سالک)

"یہ تو معلوم ہو چکا کہ ابخروں کے ٹھنڈے ہو کر بھاپ کی شکل بن جانے سے ابر پیدا ہوتا ہی جب تک ابخرے کم کم اور آہستہ آہستہ جمتے رہتے ہیں اس وقت تک ابر ہی ابر پیدا ہوتا ہی - مینہ نہیں برستا مگر جب آمد ابخروں کی زیادہ ہوتی ہی اور سرعت کے ساتھ تہ پر تہ جمنے شروع ہوتی ہی اس وقت پانی کے ذرے جن سے یہ ابر مرکب ہے دوسرے سے مل مل کر بڑے قطرے بننے لگتے ہیں اور اپنے بوجھ سے زمین پر گرنے لگتے ہیں اور مینہ برسنے لگتا ہے"

پانی اور ہوا کا بیان (سید حسین بلگرامی)

ناظرین اس دور کی ترقی ملاحظہ کر چکے - اس مختصر بیان سے بھی دکن کے کارنامے نمایاں بتین طور پر واضح ہوتے ہیں لہذا دور ثانی سے اب ہم رخصت ہوتے ہیں -

---

دورِ ثالث

از ۱۲۹۳ ہجری تا ۱۳۳۶ ہجری

اب ہم ایسے دور میں پہونچ چکے ہیں جبکہ اردو کا درخت اچھی طرح بارآور ہو چکا ہے اور رنگ رنگ کے پھول کھل چکے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ سرکاری دفاتر کی زبان بجائے فارسی کے اردو ہو چکی ہے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ زبان کی ترقی اس وقت تک نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ وہ زبان اس ملک کی کاروباری زبان کے ساتھ ساتھ سرکاری زبان بھی نہ ہو۔ چنانچہ انگلستان ہی کو لیجیے اسکو اس وقت تک ترقی نصیب نہیں ہوئی جب تک کہ لاطینی اور یونانی زبان کی بجائے انگریزی زبان کو قایم نہ کیا گیا۔ اور اسی طرح جاپان کی ترقی بھی ہمارے دعوی کی بیّن دلیل ہے:

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے۔ اب اردو کے لئے وہ زمانہ آچکا ہے جس کو ابتداء عالم شباب کا لقب دینا غیر موزوں نہیں۔ دکن کی اس دور کی کشش نے جو مقناطیس سے زیادہ پر زور تھی۔ اطراف ہند کے باغبان گلشن اردو کو اپنے دامن عاطفت میں کھینچ لیا۔ جہاں استاد فصیح الملک بلبل ہند مرزا داغ دہلوی دربار رام پور کو خیرباد کہہ کر یہاں متوطن ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت آصف جاہ خامس کی استادی کی عزت حاصل ہوتی ہے اور خطاب فصیح الملک بلبل ہندوستان جہاں استادسے بجا طور پر مفتخر و ممتاز ہوتے ہیں۔

داغ کے کلام کی سادگی اور عام مذاق میں اثر پیدا کرنے والی غزلیں ہندوستان میں عام طور پر مقبول ہوئیں اور حقیقت یہ ہے کہ سادگی میں ادائی کلام وہ مزا دے جاتا ہے جو داغ اور صرف داغ کا حصہ ہے۔

شاہ نصیر کی طرح داغ بھی یہیں پیوندِ زمیں ہو گئے۔ اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ داغ نے یہاں بسر کیا۔ اس لئے میرا مضمون نامکمل ہوگا اگر کچھ نمونہ اُن کے کلام کا پیش نہ کیا جائے۔

دل لے کے اس کی بزم میں جایا نہ جائے گا — یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا

مجھ سا دے زمانہ کو پروردگار دل — آشفتہ دل فریفتہ دل بے قرار دل

دونوں دشمن ہیں بشر کے آسماں ہو یا زمیں — فتنہ گر بالائے سر ہے تو ستمگر زیر پا

عرصہ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو — اور پھر ڈھونڈھتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں　　جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں
دمِ موذن نے شب وصل اذان پچھلی رات　　ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا
دستِ ہوس بڑھا کر کیوں مرتبہ گھٹایا　　سمجھی نہ یہ زلیخا دامن ہے پارسا کا

داغ کی طرح امیر کو بھی حیدرآباد کی خاک کھینچ لائی۔ رام پور سے یہاں پہونچے۔ لیکن زندگی نے ساتھ نہ دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا سے منہ پھیر لیا۔ قالب بے جان سپردِ خاک ہوگیا۔ روح پاک نے فردوس بریں کا راستہ لیا۔

امیر کا اصلی مذاق صوفیانہ تھا۔ آپ کا کمال غزلوں اور قصیدوں سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں نعت کا جس قدر مرتبہ آپ کے کلام کو حاصل ہے کسی کو میسر نہیں۔ عشقِ رسول میں ڈوبا ہوا آپ کا مسدس اپنا آپ نظیر ہے۔

آہوں سے سوزِ عشق مٹایا نہ جائے گا　　آندھی سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
وہ بے کس ہوں نہیں ہے کوئی میرے غمگساروں میں　　فقط اک دل ہے سو وہ بھی تمہارے جاں نثاروں میں
حسنِ مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا　　لامکاں کہتے ہیں جس کو وہ مرا کاشانہ تھا
دی گئی منصور کو سولی ادب کے ترک پر　　تھا انا الحق حق مگر اک حرف گستاخانہ تھا
ہوا بند کھل گیا ہے کسی گلعذار کا　　آنچل لٹک رہا ہے عروسِ بہار کا
گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں　　مٹا ہوا سا نشان سرِ مزار ہوں میں
لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیر　　آئے تھے دنیا میں اسی دن کے لئے[2]

داغ اور امیر کی طرح اردو کے مشہور ناولسٹ پنڈت رتن ناتھ سرشار پر بھی حیدرآباد کی کشش نے کام کیا۔ سرشار کا مدتوں یہاں قیام رہا۔ کئی سال تک رسالہ دبدبۂ آصفی[3] کی اڈیٹری کرتے رہے۔ پنڈت سرشار کی تصنیفات اردو کی بہترین ناول یا فسانے خیال کئے جاتے ہیں۔ مختلف طبقوں کی بول چال اور معاشرت کا دلچسپ خاکہ ہو بہو کھینچنا آپ ہی کا حصہ تھا

اسی طرح ہندوستان کے زبردست انشا پرداز اور مورخ علامہ شبلی نعمانی اور مولوی عبدالحلیم شرر کی زندگی کا بہت بڑا حصہ حیدرآباد میں بسر ہوا۔ اردو ہی کی خدمت کے ضمن میں ان اصحاب نے یہاں کے دائرۂ ملازمت میں بھی شرکت کی۔

ان اصحاب کے علاوہ ہندوستان کے مشہور یگانۂ آفاق مرثیہ نویس انیس[4] اور اُن کے

---

۱ دیوان داغ ۲ دیوان امیر ۳ رسالہ دبدبۂ آصفی ۴ ایشیائی شاعری از اشہری۔

قابل جانشین ہر سال ماہ محرم میں آتے اور اپنے جاں سوز مرثیے سناتے رہے۔
غرض اس دور کی قدردانی علم و فن بھی زمانہ سابق کی طرح گلشن اردو کی آبیاری کے لئے ہر طرح حیات بخش اور بے مثل رہی۔

اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت خود غفران مکان حضرت آصف جاہ سادس کا کلام بلاغت نظام ہے۔ آپ داغ کے شاگرد تھے۔ جملہ اصناف نظم پر آپ کو قدرت حاصل تھی۔ علاوہ غزلیات وغیرہ کے "تعلیم" "فوج" اور "اصلاح فوج" وغیرہ کے متعلق بھی آپ کی مختلف اور متعدد اخلاقی نظمیں ہیں۔ رعایا کے مختلف فرقوں کے سپاس ناموں کے جواب میں آپ نے اپنی سالگرہ کے موقع پر نہایت عمدہ و بے مثل نظمیں اکثر و بیشتر سنائی ہیں۔ ذیل میں کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

اس کو بھی ہے یقین عنایت اسی طرح — سرکار کو ہے جیسے سپاہی کا اعتبار

تمہاری طرف سے وفاداریاں — ہماری طرف سے کرم گستری
ہنرور سے ہے سلطنت کا نمود — ہنر ہی سے ہوتی ہے نام آوری

علم کی قدر کرو قدر کرو قدر کرو — تم کو اللہ نے بخشی ہے اگر طبع سلیم
سمجھو سمجھو وہ نکات اور وہ اسرار و رموز — دیکھو دیکھو وہ کتب جو ہیں جدید اور قدیم
علم ہے اس کی دوا اور دوا بھی اکسیر — کہ جہالت بھی ہے منجملہ امراض سقیم
طالب علم ذکی اور ہو استاد شفیق — کیوں پسندیدہ نہ ہو ایسی تعلم تعلیم
فہم و دانش کی ترقی کا یہی باعث ہے — علم کی وجہ سے تھے حضرت لقماں بھی حکیم
قابل صحبت شاہان و سلاطیں ہے وہی — عزت اس کی ہے جو کہلائے زمانہ میں فہیم
دین و دنیا میں جو پھیلی تو اسی کی خوشبو — مشک اذفر کی نہ یہ عنبر سارا کی شمیم
ایسی دولت کے لئے کوشش و محنت ہے فرض — گرچہ تقدیر عطا جس کو کرے رب کریم
یہ جو آصف نے کہا غور سے اسکو سمجھو — علم وہ شئی ہے کہ اللہ کا ہے نام علیم

ایک نظم کا مطلع ہے:-

مجھ کو مبارک اور مرے دوستوں کو بھی — سامان جشن عیش ہے فرحت کے واسطے

اسی نظم کا آخری شعر خصوصیت سے قابل ملاحظہ ہے۔

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ — گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے

سلہ ۳ تزک محبوبیہ

اخلاقی نظموں کی طرح آپ کی عاشقانہ اور دلکش غزلیات بھی قابل داد ہیں۔ اشعار کے ملاحظہ سے واضح ہوگا کہ لطف زبان۔ ترکیب کی خوبی۔ فصاحت مضمون۔ محاورات روزمرہ ہر پہلو سے لایق صاد ہیں۔ کیوں نہ ہو آخر کلام الملوک ملوک الکلام ہوتا ہے۔

خون تک دل کا نہ چھوڑا رکھتے ہی سینہ پہ ہاتھ
واہ واہ دزد حنا کیا ہاتھ کا چالاک تھا

فاتحہ پڑھتے ہوئے اس نے سمیٹے دامن
جب میرا دست ہوس قبر سے باہر نکلا

مل گئیں خاک میں کیا میری وفائیں ظالم
حرف انکار زباں سے ترے کیونکر نکلا

واہ کیا لطف ہوا وصل کی شب ان کے قریب
غیر سے وعدہ کا کاغذ سر بستر نکلا

کبھی نہ دب کے ملیں گے ہم ان سے اے آصف
وہ شاہ حسن ہیں ہم بھی شہریار ہم بھی ہیں

واہ اے شان کریمی ترے صدقے قرباں
جس گنہگار کو دیکھا وہ گنہگار نہ تھا

تجھے غیر سے دو دن بھی نباہی نہ گئی
آپ کے ذہن میں آصف تو وفادار نہ تھا

لائے تھے وہ رقیبوں کو میرے مزار پر
اڑ کر غبار سامنے دیوار ہو گیا

لو اور سنو کہتے ہیں وہ دیکھ کے مجھ کو
یہ شخص بلاشبہ ہے دیوانہ کسی کا

آصف کا ہی یہ قول سنیں صاحب غیرت
احسان نہ لے ہمت مردانہ کسی کا

وصل میں تلخ بھی دشنام مزا دیتے ہیں
کوسنے والوں کو ہم دل سے دعا دیتے ہیں

ایسے لوگوں میں نہیں ہم جو کہیں اور نہ کریں
مرد جو کہتے ہیں وہ کر کے دکھا دیتے ہیں

ان حسینوں سے کوئی خون کا دعویٰ کیا کرے
خوں بہا دیتے نہیں خون بہا دیتے ہیں

رہے ہر دم میں ہر دم یاد تیری
جدھر دیکھوں ادھر بس تو ہی تو ہو

مقابل یوں ملے جب حسن کی داد
ادھر یوسف ادھر بے پردہ تو ہو

یہ کافر حسیں ایک جا جمع ہوں گے
جہنم میں بھی اک طرح کا مزا ہے

مرے حال بد پر کرم کرنے والا
خدا ہے خدا ہے خدا ہے خدا ہے

یہ امتحاں تو دیکھو وہ مجھ سے پوچھتے ہیں
پسند ہے تمھیں اس شہر میں ادا کس کی

دل میں ہمارے ایک صنم پردہ دار ہے
آئے خیال غیر تو پردہ پکار کے

بیتاب دل کے ہاتھ سے ہے میری لاش بھی
اندر مزار کے کبھی باہر مزار کے

نشان اہل نشان ہو گئے بہت معدوم
ظہور قدرت پروردگار باقی ہے

بجا ہے قدر کرو جس قدر میرے دل کی
کہ عاشقوں میں یہی یادگار باقی ہے

یہ شب وصل ان کو حسرت ہے ——— شام ہوتے ہی کیوں سحر نہ ہوئی

بے تمنا بھی کہیں عشق میں ہوتی ہے بسر ——— ایک نکلتا جو مجھے دوسرا ارماں ہوتا

جو کامیاب نہ ہو کوئی یہ نصیب اس کا ——— نہیں قبول کی آصف نے التجا کی

کرکے وہ تیغ زنی مجھ پہ ہوا چیں بہ جبیں ——— یعنی میں قتل بھی کرنے کے سزاوار نہ تھا

اس کے جانے سے تجھے موت نہ آئی آصف ——— ایسی رسوائی سے جینا تجھے درکار نہ تھا

تری تیغ جب ہم علم دیکھتے ہیں ——— وہیں سر کو اپنے قلم دیکھتے ہیں

لب مسیحا سے کرے بات تو اے مصحف رو ——— مردہ دل کیوں نہ جئے جس کا کلام ایسا ہو

زلف مشکیں میں پر پیچ کے یہ دل کیوں نہ پھنسے ——— ایسا صیاد ہو اور ہاتھ میں دام ایسا ہو

قمر کو ہوتا ہے ہر ماہ میں کمال و زوال ——— ترے بھی حسن کا عالم یہ ہے نہ رہے نہ رہے[1]

دور ثالث کی نظم

اب میں اس دور کے چند قابل شعرا کے کلام درج کرتا ہوں تاکہ اس دور کی نظم کا اندازہ ہو سکے اور اردو کی ترقی کا کلام سے قیاس کیا جائے۔ یوں تو اس دور کے شعرا کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے مگر ان میں سے صرف ممتاز اور نامور شعرا کا بھی انتخاب کیا جائے تو بھی اس مختصر مضمون میں گنجایش نہ ہوگی۔ اس لئے صرف چند شعرا کے کلام کو جگہ دی جاتی ہے۔

شاد | اس دور کے ایک مشہور شاعر مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنتہ ہیں جن کا تخلص شاد ہے آپ مہاراجہ چندو لال کے نواسہ ہیں اپنے "نانا کی طرح آپ کا کلام بھی صوفیانہ رنگ میں نگا ہوا ہوتا" آپ کے یہاں اکثر مشاعرے[2] ہوا کرتے تھے جہاں شعرائے وقت کا بہترین مجمع ہوا کرتا تھا۔ آپ کی سرپرستی میں اکثر رسائل شایع ہوئے ہیں۔ پنڈت سرشار کو بکمال علم دوستی آپ ہی نے طلب کرکے اپنے رسالہ "دبدبہ آصفی" کی اڈیٹری پر مقرر فرمایا تھا۔ اس سے اردو کی ترقی میں آپ کی سعی جمیلہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ کو جملہ اصناف نظم میں کامل دستگاہ حاصل ہے۔ غزل۔ مثنوی۔ قصاید۔ قطعات۔ رباعیات آپ کی نہایت عمدہ ہوتی ہیں۔ تاریخ کہنے کا بھی آپ کو خاص ملکہ ہے۔

آپ کے کلام کے مختلف حصص شایع ہو چکے ہیں۔ اردو کے اکثر رسالوں میں آپ کا کلام درج

---

[1] مختلف مجموعات نظم مطبوعہ [2] تذکرہ شعرا دکن۔

ہوتا ہے۔ بطور نمونہ کچھ کلام پیش کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ آپ کا کلام کیا بہ لحاظ نزاکت خیال ولطافت بیان اور کیا بہ لحاظ ندرت جذبات و پاکیزگی حسیات اپنا آپ نظیر ہے۔

کافر نہ کہو شاد کو ہے عارف وصوفی　　　شیدائے محمد ہے وہ شیدائے مدینہ

احمد کے در پہ اس لئے میں جبہ بسا رہا　　　سجدے کے لایق اور کوئی آستاں نہ تھا

معراج میں حضور جو مدعو خدا کے تھے　　　خلوت تھی کوئی اور وہاں میہماں نہ تھا

کفر چھوڑا پی کے مئے توحید کی　　　رنگ شاداب عاشقانہ ہوگیا

بال کھولے ہوئے اے گیسوؤں والے آجا　　　آجا آجا مجھے دامن میں چھپالے آجا

خوف یہ ہے کہ نہ ہو نوح کا طوفاں برپا　　　رونے سے پہلے مجھے یار منالے آجا

گزرتے ہیں جی سے گزر جانے والے　　　بہت یاد آتے ہیں مرجانے والے

کسی کا یہاں حال کیا ہو رہا ہے　　　خبر بھی ہے او بے خبر جانے والے

مرا اور تیرا افسانہ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے　　　وہی درد دل میں یارانہ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے

مبارک شاد زاہد کو یہ جھگڑا کفر اور دیں کا　　　مرا مشرب فقیرانہ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے

ہوا نہ حال پہ وہ شوخ مہرباں فریاد　　　الٰہی یوں ہی گئی میری رائگاں فریاد

ستم رسیدہ ہوں ایسا کہ میری حالت پر　　　زمین آہ کرے اور آسماں فریاد

زمیں سے آہ جو کھینچی فلک پہ جا پہنچی　　　خدا کی شان کہاں سے گئی کہاں فریاد

جفائیں لاکھ سہیں اور سہے ہزار ستم　　　نہ آئی ضبط محبت سے تا زباں فریاد

مثنوی

ساقی دے جام ارغوانی　　　جس سے ہو امنگ پر جوانی

لا جلد پلا دے دیر کیا ہے　　　رندوں کے لئے سبھی روا ہے

طاقت نہیں مجھ کو کر توانا　　　غم منہ سے لگا نہ کر بہانہ

اس وقت وہ صبح دل کشا ہے　　　پھولوں کی بہار جانفزا ہے

نکہت سے گلوں کی روح پرور　　　ہے آج مشام جاں معطر

آمادہ ہوں آج کچھ لکھوں میں　　　مدح خواجہ میں کچھ کہوں میں

لازم ہے مجھ کو نغمہ سنجی　　　رکھتا ہے یہ آرزو مراجی

---

[1] مہاراجہ بہادر کے بعض مطبوعہ کتاب یہ ہیں۔ نذر سلطان۔ ترانہ شاد۔ نغمہ شاد۔ صبح امید۔ گلبن تاریخ۔ ہدیہ شاد۔ رباعیات شاد وغیرہ

ممدوح کی مدح لکھ رہا ہوں — مداح حبیب مصطفےٰ ہوں

چند رباعیات پیش کی جاتی ہیں جو بہ لحاظ حسن و خوبی اپنی آپ نظیر ہیں۔

بندے کو ہو دعوٰی خدائی واللہ — کیا بات ہے کیا بات ہے سبحان اللہ
ہو مور ضعیف کو سلیماں سے کد — پر لگ گئے چیونٹی کو ماشاء اللہ

پانی جو برس رہا ہے یہ رحمت ہے — کیا شان ہے معبود کی کیا قدرت ہے
دھوتا ہے گنہگاروں کے سارے اعمال — یہ بندہ نوازی ہے عجب حکمت ہے

گھر سے جو چلے جا کے لحد میں پہونچے — ہم ہو کے فنا دار ابد میں پہونچے
دریا سے نہیں شاد جدا کچھ یہ حباب — چلتے چلتے سب اپنی حد میں پہونچے

ہشیار ہو غافل کبھی مرنا ہے تجھے — مٹی میں کہیں مقام کرنا ہے تجھے
ہوگی اک دن فنا یہ ہستی اے شاد — اس دار فانی سے گزرنا ہے تجھے

ہرگز نہیں ہم رنگ بدلنے والے — ہیں مرد نہیں بات سے ٹلنے والے
حساد کو کیوں رشک نہ ہوگا اے شاد — جلنے کے لئے آئے ہیں جلنے والے

قطعہ

نہیں باد مخالف کا مجھے ڈر — نہ ہے کچھ ناخدا کی مجھ کو پروا
خدا حافظ مری کشتی کا ہے شاد — کلت علی اللہ تعالیٰ

کون مرتا ہے کوئی مرتا نہیں — موت جو ہے وہ فقط ہے اک حجاب
خواب جو ہے عین بیداری ہے شاد — اب جو بیداری ہے وہ ہے عین خواب

جیسا کہ میں نے قبل ازیں لکھا ہے مہاراجہ کو تاریخ نویسی کا بھی خاص ملکہ ہے۔ طوالت کے خیال سے صرف ایک قطعہ تاریخ درج کیا جاتا ہے جس کو آپ نے اعلیٰحضرت معظم آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کی تخت نشینی کے موقع پر موزوں فرمایا تھا۔

سلامت رہیں میرے آقا الٰہی — بقا جن کے دم سے ہے ملک دکن کی
وہ آقا جو ہیں مسند آرائے دولت — شہ ذی فتوت مہ کامگاری
سعید جہاں میر عثمان علی خاں — امیروں کے سلطاں غریبوں کے والی
ہوے جلوہ آرا جو تخت پدر پر — تو سب نے کہا جان میں جان آئی
یہی شاہ محبوب کے جانشیں ہیں — انھیں سے ہے خستہ دلوں کی تسلی

یہی مرہم زخم بے چارگاں ہیں — انھیں سے شفا دردمندوں کو ہوگی
خدا کے کرم سے ہے امید ہم کو — کہ یہ نونہال گلستان شاہی
اب و جد کے نعم البدل ہونگے ثابت — رہے گا جہاں ہو کے ان کا فدائی
رعایا کے دل کو مسخر کریں گے — بصد دل نوازی بصد چارہ سازی
خلایق کے محبوب ہو کر رہیں گے — پدر کی طرح سے یہ تائید باری
ہوا خواہ خرم ہوں بدخواہ پرغم — بڑے عمر اور اقبال میں ہو ترقی
یہ تاریخ دے نذر اے شاد چل کر — مبارک ہو سرکار مسند نشینی

دو اور رباعیات قابل ملاحظہ ہیں جو غم اور خوشی کی حالت[29] کو کس خوبی سے ظاہر کرتی ہیں[30]۔

آصف کی جدائی کا بہت کچھ غم تھا — ہر روز مرے گھر میں نیا ماتم تھا
آئے جو حضور کلبۂ احزاں میں — میرے دل مجروح کا یہ مرہم تھا
توقیر بڑھائی مرے شاہا تو نے — قطرہ سے کیا گوہر یکتا تو نے
خلعت کا کروں ذکر کہ میں عزت کا — کیا کچھ نہ دیا اے مرے آقا تو نے

ایک اور رباعی ملاحظہ ہو کس خوبی سے اپنے قرض کا اظہار اور بادشاہ سے استمداد کی ہے

دیندار ہوں اس واسطے ہے دین کا بار — عادت نہیں مانگوں جو ہمیشہ سرکار
تکیہ ہے توکل پہ خدا سے ہے امید — ہو جائے گا سب ادا جو چاہے کرتار

میر اعظم علی شایق | حیدرآبادی امیر اور مولویانہ گھرانے سے تھے۔ آپ کا پورا دیوان نعت سے معمور ہے[1] اور عشق النبی میں ڈوبا ہوا ہے۔ عام طور سے آپ کی نعتیہ غزلیں مقبول ہیں۔ عموماً نعت خواں آپ ہی کا کلام پڑھا کرتے ہیں۔ آپ نے ٹھمریوں میں بھی نعت کہی ہے۔ کلام ملاحظہ ہو:۔

محبت بڑھتے بڑھتے عشق ہو جائے — یہی دانہ بنے خرمن خدا کا
دیکھ کر طاق حرم تھام کے دل بیٹھ گیا — خم ابرو ترا جب قبلہ من یاد آیا
ہے درد کبھی آہ و فغاں اور کبھی نالا — اے ہجر نبی ان سے پڑا ہے مجھے پالا
راز وحدت صاف آئینہ بنے گا سامنے — نور احمد جب میرے دل میں چمکتا جائیگا
نہ کیوں بسمل ہو ہر ہر تیغ ابروئے محمد کا — لیا ہے پہلے بسم اللہ کہہ کر درس ابجد کا
وہ شایق کی ہو مقبول پھر تجھ بن یا رب — مدینے میں ہوں جاکر مجاور پاک مرقد کا
ہوں وہ دکھنی کہ دکن ناز سے یہ کہتا ہے — کرسی ہند پہ کوئی ترا بازو نہ ہوا

---

[1] دیوان شایق۔

دل مرا تو نے لیا ہے مجھے دے دل اپنا ——— فیصلہ یوں ہو تو کچھ حاجت ضامن ہی نہیں
سوئے طیبہ جو چلے راہ حرم بھول گئے ——— دیکھ کر تیری گلی باغ ارم بھول گئے
اے لباس زہد و تقویٰ آخر کی تسلیم لے ——— ان گناہوں سے ہماری خوب عریانی ہوی
شایق بتوں سے دل کی نہ قیمت کرو کمی ——— اللہ کو منہ دکھاوگے کھر بیچ ڈال کے
مرشوں اس طرح اے شایق غم شبیر میں ——— بے نشانی خود نشاں بن جائے نام ایسا تو ہو

کیفی | اب میں اس دور کے ایک مشہور اور نامور حیدرآبادی شاعر کا ذکر کرتا ہوں جن کا کلام تمام دنیائے اردو سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ سید رضی الدین حسن کیفی جملہ اصناف کلام میں کمال رکھتے تھے۔ کیفی کی بے وقت اور اچانک موت ایک بڑا ادبی اور قومی سانحہ ہے۔ ہمارے کانوں میں ہنوز وہ نغمہ سنجی گونج رہی ہی جو مختلف قومی جلسوں میں ان کے خاص انداز میں ہم سنا کرتے تھے وہ سماں اور وہ جوش کبھی بھلایا نہیں جا سکتا جو مرحوم کی ولولہ انگیز حیات بخش روح پرور نظموں کے سننے سے پیدا ہو جاتا تھا۔

اگرچہ کیفی دار فانی سے گزر گیا مگر اس کا کلام جب تک زبان اردو اس صفحہ روزگار پر باقی ہی زندہ رہے گا۔

آؤ دیکھیں کیفی نے اس گلشن اردو کی سرسبزی اور آبیاری میں کیا کیا گل بوٹے کھلائے ہیں اور کیسے کیسے نئے پودے لگائے ہیں۔ کیفی کی تمام نظمیں اپنی فصاحت و بلاغت جدت و حسن تخیل۔ واقعہ نگاری روزمرہ غرض کہ ہر خوبی سے ممتاز ہیں۔

ان بے شمار نظموں کے منجملہ جو شایع ہو چکی اور مقبولیت عامہ حاصل کر چکی ہیں چند یہ ہیں۔ تاثیر محبت۔ جاہلیت کی انسانیت۔ وفائے عرب۔ بے فکری کا کرشمہ۔ سچا دوست۔ شکر نعمت سفر وطن۔ قرضہ حسنہ۔ تعلیم نما۔ جاپان تلمیذ یورپ۔ چشمہ حیات۔ جام حیدری۔ ثمرہ وغیرہ

یہ تمام نظمیں بہمہ صفت موصوف اور شاعر کے کمال شاعری کا بہترین ثبوت ہیں۔

جاہلیت کی انسانیت میں امراء القیس اور سموائل کے مشہور قصہ کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہی اور سموائل کی وفاداری کو کیا خوب ادا کیا ہے ؎

ایک نوخاستہ فرزند سموال بے صید ——— اتفاقاً جو کہیں گھر سے گیا تھا باہر
گھر کو واپس جو ہوا دشت سے وہ صید افگن ——— دست صیاد اجل سایہ فگن تھا سر پر
یعنے اس بچے کو حارث نے گرفتار کیا ——— اور سموال سے کہا غیظ و غضب میں آکر
دیکھ! ہی خیر اسی میں کہ وہ دیدے ہتیار ——— ورنہ یہ تیغ ہی یہ ہے ترے فرزند کا سر

اُس جوانمرد نے خاطر میں نہ لا کر اس کو — غیر کی ملک کو فرزند سے سمجھا بڑھ کر
باپ کے سامنے بیٹے کو تہ تیغ کیا — پھر بھی ناکام پھرا گھر کو وہ ظالم کا پسر[1]

وفائے عرب

پڑے تھے جو نعمان کے دل میں چھالے — اڑے تھے جو سینے میں جانکاہ نالے
بڑے شد و مد سے سر اپنے نکالے — ہوئے ظاہر اس طرح صورت بدل کر

دیا حکم نعمان منذر نے فوراً
عمر ابن مسعود و خالد کا مدفن
بنے خوش نما خوش فضا رشک گلشن
کلس قبہ و گنبد و قبر منظر

عمارت بنی شاندار اور گنبد — لگائے گئے قیمتی سنگ مرقد
مٹا اس کے دل سے نہ یہ رنج بیحد — تو کی اس نے یہ رسم انوکھی مقرر

کہ اس کی رہے یادگار ایک باقی
جو ظاہر کرے شان شادی و غم کی
برس دن میں دو بار ہو بات ایسی
بھلائے نہ جس کو کوئی زندگی بھر[2]

واقعات قابل داد سلاست بے تکلفی کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک اور نظم جاپان تلمیذ یورپ ہے جاپان کی جغرافیائی اور تاریخی حالت اور اس کی ترقی کا ذکر جس خوبی اور خوش اسلوبی سے کیا ہے وہ اردو زبان میں بالکل نیا اضافہ ہے۔ جاپان کی زبان سے اس کی حالت کا اظہار نظم میں ایک خاص کیفیت اور اثر پیدا کرتا ہے۔

دھوم عالم میں زمانہ میں ہے شہرت میری — اللہ اللہ رے میں واہ رے قسمت میری
جس نے دیکھا نہیں اب تک کبھی صورت میری — اُس کے دل میں بھی سمائی ہے محبت میری
ذکر ہوتا ہے مرا انجمنوں میں کیا کیا — بچے بچے کی زباں پر ہے حکایت میری
ایشیائی ہوں میں اور ان میں بھی اک معمولی — خود میں کہتا ہوں یہ ہے اصل حقیقت میری
یاد پڑتا ہے کہ گزرے ہیں برس ڈھائی ہزار — غالباً ہے یہی تاریخ ولادت میری

[1, 2] ماخوذ رسالہ صحیفہ ماہواری

جن کو معلوم نہیں ان کو بتاتا ہوں پتا — ایک مدت سے اسی جا ہی اقامت میری
میرے اطراف و جوانب میں ہی بحرالکاہل — چین تاتار کے مشرق میں ہی دولت میری
فارموزا سے چلے جائیے تا کیو رائل — آپ ہو جائیگی ظاہر جو ہے وسعت میری
رنگ بدلے ہیں زمانہ کی طرح میں نے بھی — لیکن اس سے نہیں بدلی کبھی ہئیت میری
غیر قوموں نے نہ کی مجھ پہ حکومت ہرگز — کی میری قوم نے اول سے حمایت میری

واقعہ نگاری کا بہتر سے بہتر نمونہ کلام کیفی میں نظر آتا ہی ۔ چشمہ حیات ۔ خیر المبین اسکے شاہد ہیں ۔ چشمہ حیات کی نظم ملاحظہ ہو گر یہ بھی لحاظ رہے کہ شاعر مقام پر موجود نہ تھا صرف سنے ہوئے واقعات کو جس خوبی سے ادا کیا ہی وہ اعجاز ہے اور پھر نظم میں سکا بلہ کو اس خوبی اور بے تکلفی سے ادا کرتا ہی کہ حیرت ہوتی ہی ؎

دیکھنا وہ دیکھنے والے بھی آئے ہیں ادھر — عرس سے آیا ہی اٹھ کر جگمگیے کا جمگھٹا
اعلیٰ ادنیٰ اوسط ان میں ہر طرح کے لوگ ہیں — سب کے سب خوش خوش ہیں منظر دیکھ کر بالا بکا
پا پیادہ بعض ہیں بعض ہیں گھوڑوں پر سوار — مشکی گھوڑی کا سوار ان سب میں ہی ممتاز سا
ہاتھ میں بندوق ہی اور سب ہیں اسکے گرد و پیش — ہو نہ ہوا ول تعلقدار ہو یہ باجسرا
آئے ہیں تالاب پر یہ لوگ سب بہر شکار — بے سبب تو ہو نہیں سکتا بطوں کو تاکنا
اے لو اس بندوق والے نے تو کی بندوق سر — دو بطیں اک فیر میں کر لیں شکار اب دیکھنا
گھرے پانی میں ادھر تو پھڑ پھڑاتی ہیں بطیں — اور ادھر عالم نہ پوچھو ساتھیوں کے شوق کا
کوئی کہتا ہی اگر ہو حکم تو لاؤں ابھی — کوئی کہتا ہے مجھے آتا ہی اچھا تیرنا
تھا خوشامد سے مفر لالچ کسے آمادہ کوئی — ہو گیا تیار ہی جانے کو جب اک منچلا
تب تعلقدار صاحب نے کہا اس شخص سے — جاؤ جاتے ہو تو لیکن سوچ لو اس کو ذرا
شاخ در شاخ اس میں بیلیں اور کائی ہی بہت — جان بھی پھنسکر نہ رہ جانا کبھی بے دست و پا
دیکھو جب تک پاؤں سے تم چل سکو تالاب میں — بس وہیں تک جا کے پچھلے پاؤں آجانا بھلا
گر بطیں مل جائیں تو لے آؤ ورنہ کچھ نہیں — تیر کر آگے نہ بڑھنا سمجھے میں نے کیا کہا[1]

تاثیر محبت ۔ انگلستان کے نامور شاعر لارڈ ٹنی سن کی نظم "لیڈی کلیر" کا ترجمہ ہے قافیہ کی سنگلاخی سے کہیں سلاست و روانی کلام میں فرق نہیں آیا ۔ ایک ایک شعر پڑھ مترجم

---

[1] رسالہ صحیفہ ماہواری۔

شاعر کی کامیاب کوشش کی داد بے ساختہ دینی پڑتی ہے۔

لیڈی کلیر اپنے اصلی حال سے آگاہ ہونے پر جبکہ عقد کو صرف ایک دن باقی رہتا ہے وہ اپنی دایہ پر خفا ہوتی ہے اور اس کی سچائی یہاں معلوم ہوتی ہے کہ وہ متعاقب شوہر بننے والے کو فوراً اس حال سے آگاہ کر دیتی ہے تاکہ وہ اس دھوکہ میں نہ رہے کہ یہی "اصلی" لیڈی کلیر ہے

اماں اگر یہ سچ ہے تو تم نے کیا وہ کام	اس سے زیادہ اور نہ ہوگا کوئی گناہ
اک بہترین خلق شریف المزاج کو	محروم اپنے حق سے رکھا تم نے دیرگاہ
دایہ تڑپ کے بولی مری جان میں فدا	یہ راز فاش کر کے نہ کرنا مجھے تباہ
اس نے کہا کہ جھوٹ نہ مجھ سے بن آئیگی	افشائے راز میں نہ کرو سعی اشتباہ
راسنیلڈ سے ضرور کہوں گی یہ سرگذشت	دریافت ہوگی اس کی وفا کی بھی اس سے تاہ
دایہ ہزار چیختی چلاتی رہ گئی	لیڈی نے ایک بھی نہ سنی اسکی آہ واہ
زیور تمام سر سے قدم تک اُتار کر	جوڑے میں رکھ لیا فقط اک پھول کچھ گیاہ
پوشاک فاخرہ سے سبکدوش ہوگئی	اک سیدھا سادا گون پہن کر وہ رشک ماہ
اس وضع سے مکان پہ راسنیلڈ کے گئی	لینے کو آیا اس کے وہ بیرون خوابگاہ[1]

آخری زمانہ میں کیفی کی توجہ غزلوں کی پرانے اور فرسودہ ڈھب کی شاعری سے زیادہ جدید طرز کی شاعری کی طرف تھی۔ حیدرآباد کا کوئی اسلامی مجمع نہ ہوتا تھا جہاں کیفی اپنی نغمہ سنجی سے جوش نہ پیدا کرتے ہوں۔ شکر نعمت۔ قرضۂ حسنہ تعلیم نما۔ جام حیدری۔ ثمرہ اور خدا حافظ وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں جو مختلف قومی مجامع میں سنائی گئی ہیں۔

"شکر نعمت" والی نظم حجاز ریلوے کے افتتاح کی خوشی کے جلسہ میں اور قرضۂ حسنہ "انجمن معین المسلمین" کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی تھی "تعلیم نما" اور "جام حیدری" حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے جلسہ میں سنائی گئی تھی۔ "تعلیم نما" اگرچہ تعلیم اور حصول علم وغیرہ کے متعلق مناسب حال کانفرنس لکھی گئی ہے اور اس قسم کی بکثرت نظمیں لکھی گئی ہیں مگر جو خاص کیفیت اس نظم میں ہے وہ ملاحظہ ہی سے ظاہر ہوسکتی ہے اسی طرح دوسری نظم "جام حیدری" میں علم کی تشبیہ شراب سے دی گئی ہے یہ تشبیہ کوئی جدید ایجاد نہیں ہے لیکن جو خاص لطف اس "جام حیدری" میں ہے اور کسی جام میں نظر نہیں آتا۔ دونوں نظموں کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

لمن اتسمی التسماحا علی ما علو الاسما	کہ آدم را شرف بخشید از تشریف کرمنا

---

[1] رسالہ صحیفہ

والتسلیم علیٰ من قال للناس طلب العلم — کہ امی بود در علم و عرفاں رحمت بر دنیا
پس از حمد خدائے پاک و نعت احمد مرسل — مسلمانو! بزرگو! بھائیو! سننا مری سننا
یہ میں کہتا نہیں تعلیم میں ہیں خوبیاں یہ یہ — میں یہ کہتا نہیں ہے بہتری تعلیم سے کیا کیا
میں یہ کہتا نہیں، ہے لکھنے پڑھنے کی ضرورت کیوں — نہ یہ کہتا کہ ہے انداز تعلیم دلکش کیسا
نہ میں قرآن سے ثابت کرونگا علم کی خوبی — نہ میں دوں گا حوالہ اب بخاری اور مسلم کا
نہ لاوں گا دلیل ایسی میں اقوال ائمہ سے — نہ تاریخوں سے یہ ظاہر کروں گا علم ہے ایسا
نہ میں بغداد یونیورسٹی کا تذکرہ کرتا — نہ میں قصہ سناتا ہوں نظام الملک طوسی کا
نہ یہ کہتا گزشتہ دور میں تعلیم کیسی تھی — نہ یہ کہتا کہ چرچا علم کا اگلوں میں کیسا تھا
کہ پہلے تو نہیں ہے خود مجھی کو اتنی آگاہی — اگر ہو بھی تو ان باتوں سے اب سوتے مطلب کیا
یہ باتیں سنتے سنتے بھر گئے کان اک زمانہ سے — ہزاروں ایسے لکچر ایسی اسپیچیں سنیں صدہا
اثر ان ایسی تقریروں میں ڈھونڈو تو نہ پاؤ گے — بجز درد و دریغا ہائے حیف افسوس واویلا

....

تمھیں معلوم ہے دیتا ہے عزت کون انسان کو — غذا؟ کپڑا؟ حویلی؟ ہاتھی-گھوڑا؟ روپیہ پیسا
نہیں ہرگز نہیں انسان کی اس سے نہیں عزت — کہ ہے انسان کی عزت کا باعث شان استغنا
اگر تحصیل علمی سے غرض تحصیلداری ہو — تو سمجھو ایسے عالم کو ہوا تعلیم میں دھوکا
غرض تعلیم سے یہ ہے کہ اطمینان خاطر ہو — بھروسہ آپ اپنی ذات پر انسان کرے پیدا
وہی تعلیم ہے تعلیم انسان جس سے انسان ہو — وگرنہ پیٹ بھرنے کے لئے جیتا ہے اک کتا
بس اب تکلیف بہت کچھ کہہ چکے آؤ ادھر آؤ — متی ما تلق من تھوی دع الدنیا واھملھا[1]

جام حیدری

الا یا ایھا الساقی ادر کاساً و ناولھا — کہ علمی مشورے کی انجمن کا ختم ہے جلسا
پلادے جام صہبائے کرامت ریز اے ساقی — جھلک جس کی ہو مہرستاں! قطرہ جس کا ہو دریا

....

شراب علم کے متوالے رندو جاؤ پی پی کر — اگر جا ہو تو پیتے جاؤ جام و ساغر و مینا
خدا ناکردہ گر کچھ نشہ میں اپنے کمی پاؤ — تو فوراً جتنی چاہو ڈگڈگا کر اتنی پی جانا

---

[1] رپورٹ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس۔

یہ فیض ساقیٔ کوثر ہے بطحٰی پر نہیں موقوف | جہاں جی چاہے جب جی چاہے رکھتا مشغلہ اسکا
شب مہتاب و روز ابر کی بھی کچھ نہیں حاجت | یہ جام حیدری پیکر لگا نا حیدری نعرا[1]

انجمن ثمرۃ الادب دارالعلوم کے سالانہ جلسہ میں ایک نظم "ثمرہ" سنائی گئی تھی ملاحظہ ہو زمین کس قدر ناہموار اور دشوار گزار ہے مگر کیفی کا توسن طبع کس روانی و جولانی سے اس میدان کو طے کرتا ہے۔

دارالعلوم جس کی ہے باسٹھ برس کی عمر | سیدھا سا ہو رہا ہے اب اس کا خمیدہ قد
چہرے پہ تازگی ہے تبسم لبوں پہ ہے | منت پذیر شانہ و غازہ ہیں زلف و خد
پہنی ہے اس نے اب کے قبا اور رنگ کی | وہ دلق کہنہ خرقۂ پارینہ کر کے رد
ہر شخص کو ہے اس کی ترقی کا اب خیال | جس کو نہ ہو خیال یہ ہوگا وہ لا ولد
امید ہے بہار کہ کچھ رنگ لائے گی | بیلیں منڈھے چڑھیں گی کھلیں گے گل خرد
پھولے پھلے گی انجمن ثمرۃ الادب | دریا نوال شاہ نے دی ہے اسے مدد[2]

"وراثت علم" نام ایک طویل نظم حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس میں سنائی تھی۔ دارالعلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کے موقع پر ایک نظم "مغز سخن" اس کی تاریخ میں قلم بند فرمائی تھی ارادہ کیا تھا کہ ہزار بند اپنے حالات میں لکھیں مگر اپنی عادت کے بہ موجب اس کو ختم کرنے کے قبل دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے اور یہ نظم اسی طرح غیر مکمل رہی۔

بعض ماتمی جلسوں کی نظمیں بھی ملاحظہ ہوں تا کیفی کی مرثیہ خوانی کا بھی اندازہ ہو سکے ملا عبدالقیوم مغفور کے ماتمی جلسہ میں کیفی نے ایک پرسوز رقت انگیز دل ہلا دینے والی نظم سنائی تھی جس کے ہر ہر شعر سے رنج و غم ٹپکتا ہے ؎

[3]آج ماتم ہے بپا ہند سے تا خطۂ روم | مر گیا فخر دکن مولوی عبدالقیوم

.... | ....

وضع شیخانہ مگر مصلح کل آزاد خیال | طبع رندانہ مگر تارک بدعات و رسوم
قوم کا اپنی بہی خواہ رہا عمر تمام | تھا فدا امت مرحومہ پہ دل سے مرحوم

.... | ....

[illegible] اپنے پھرے ریل کے چند تختے کیلئے | جا بسا ہند میں ہے کوئی جہاں گرد ایسا
خوب جی کھول کے آج اس کیلئے رو اے قوم | کہ تجھے پھر تو نہ بھرتا ہے دم سر والیا

---

[1] رپورٹ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس [2] رپورٹ انجمن ثمرۃ الادب دارالعلوم [3] رسالہ صحیفہ ماہواری۔

ڈاکٹر اگھورناتھ کے ماتمی جلسہ میں بھی کیفی نے ایک اسی قسم کی نظم کہی تھی۔

"خدا حافظ" حسن تخیل کا بہترین نمونہ ہے یہ نظم مولوی الٰہی بخش مرحوم صدر مہتمم دارالعلوم کے وداعی جلسہ میں سنائی گئی تھی۔

یوں تو ہر گلزار میں آتی اور جاتی ہے بہار　　رنگ لاتی ہے نئے گل بھی کھلاتی ہے ہزار

جانے والی ہر بہار اپنا دلاتی ہے یقین　　ہر درخت بارور اس کی ہے تازہ یادگار

ایک امید قوی ہے ایک ہے کامل یقیں　　فرق ان دونوں میں ہے فرق نہاں و آشکار

آنے والے کی خوشی اور جانے والے کا ہے غم　　اس خوشی سے ہے مقدم ایسے غم کا اعتبار

....　　.......................

آخری شعر یہ ہے۔

رخصت اے کہنہ بہار گلشن دار العلوم　　ہاں خدا حافظ خدا حافظ خدا حافظ سدھار

کیفی کی ہمہ گیر طبیعت جو ہر صنف میں مساویانہ قادر الکلامی کے جوہر رکھتی تھی چند رباعیات ملاحظہ ہوں

ہر چند گناہوں سے کنارا نہ کیا　　پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا

ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر　　لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا

میدان قیامت میں مری بات رہے　　جب مجھ سے ہو پرسش تو بڑی رات رہے

چھپ چھپ کے گناہ میں نے کئے ہیں بیحد　　اللہ! مری شرم ترے ہات رہے

ہر قسم کے ہر طرح کے صدمے جھیلے　　پھرتے رہے کوچہ کوچہ میلے میلے

ہاتھ آیا نہ کچھ بغیر دست افسوس　　اک عمر تری راہ میں پاپڑ بیلے

تقدیر نے تدبیر کا دل توڑ دیا　　پیمانۂ صہبائے طرب پھوڑ دیا

دنیا تو کبھی ہم سے نہ چھوٹی کیفی　　صد شکر کہ دنیا نے ہمیں چھوڑ دیا

آفت ہے غضب ہے کج ادائی تیری　　پھر اس پہ قیامت ہے جدائی تیری

او دشمن ایمان و عدوئے عشاق　　سب پر طرہ ہے بے وفائی تیری

اب غزل کا رنگ ملاحظہ ہو۔ کیفی کی غزلیں۔ شوخی بیان۔ لطف زبان۔ حسن ادا۔ رنگین خیالی۔ اور عاشقانہ مضمون آفرینی سے لبریز ہیں ملاحظہ ہو سہ

اسیر دام زلف یار چھوٹا ہے نہ چھوٹے گا　　طلسم عشق ہے کیفی نہ ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے گا

نہ یہ سر محتسب کا ہے نہ یہ رندوں کا ساغر ہے　　یہ میرے دل کا چھالا ہے نہ پھوٹا ہے نہ پھوٹے گا

اب بھی شیدا ہے زمانے کا زمانہ تیرا
ہائے دن سن وہ ترے اف وہ زمانہ تیرا

ضد لڑکپن کی گئی اب ہے جوانی کا غرور
نہ رہا وہ نہ رہے گا یہ زمانہ تیرا

یہ شب وصل ہے اے شمع تو ہو جا خاموش
کہہ نہ دے سوز جگر ان سے زمانہ تیرا

میں ہوں دیوانہ یہ ویرانہ ہے تو کیوں آیا
کیا یہاں دفن ہے اے شیخ خزانہ تیرا

کس سے شکوہ ہے شکایت ہے یہ کس سے کیفی
کوئی ہوگا نہ یہاں ہے نہ ہوگا نہ تیرا

جی کڑا کر کے رکھو صحن گلستاں میں قدم
دل نہ غنچوں کے چٹکنے کی صدا سے ڈھلے

نزاکت کا برا ہو وہ سنورنے بھی نہیں پاتے
بڑی مشکل سے زلف عنبریں تک شانہ آتا ہے

خوشامد اور پھر اتنی خوشامد اس ستمگر کی
تجھے کچھ بھی خیال اے ہمت مردانہ آتا ہے

یہ مستی اور پھر یہ بت پرستی حضرت کیفی
بھلے مانس اسی پر دعوے اسلام کرتے ہیں

لاکھ تو چھپ چھپ کے پردوں میں ہماری جان لے
جانتے ہیں ہم بھی تجھ کو تو بھی اتنا جان لے

تیرے وعدے کا بھروسہ کیا ہو اے پیماں شکن
اعتبار آتا نہیں سر پر اگر قرآن لے

یہ سماں یہ چاندنی اے مطرب عاشق نواز
جی پھڑک جائے ہمارا ایسی کوئی تان لے

مار ڈالا مار ڈالا لٹ گئے ہم لٹ گئے
تان لے پھر تان لے منہ پر دوپٹہ تان لے

وہاں تو بزم میں دشمن چلے آتے ہیں دشمن پر
یہاں فریاد پر فریاد ہے شیون ہے شیون پر

جنوں کے جوش میں ثابت گریبان رہ نہیں سکتا
مرا احسان رہتا ہے ہمیشہ میری گردن پر

تمنا اور پھر کیسی تمنا اُن کے آنے کی
بر آئے گی مگر کب ہاں بعد میرے میرے مدفن پر

دل بیتاب کو تسکین دیتے جاؤ رہ رہ کر
کہیں سبقت نہ لیجائے تمھارے چلبلے پن پر

وہی کیفی وہی رستہ ہے آندھی ہو کہ بارش ہو
چلے آتے ہیں حضرت میکدے سے ایک ہی گن پر

مانتا ہوں کہ مجھے تاب نظارا تو نہیں
دور ہی رہتے مگر یہ بھی گوارا تو نہیں

کیوں خفا ہوتے ہو مجھ مست سے اے حضرت شیخ
میں گناہگار خدا کا ہوں تمھارا تو نہیں

دل کسی کا نہیں ملتا نہیں ملتا ہم سے
غیر کی ملک ہے کچھ اپنا اجارہ تو نہیں

خال ہندو کو ترے کعبہ دل دیتا ہوں
مرے قبضہ میں سمرقند و بخارا تو نہیں

چھوڑ کر تجھ کو کہاں جائے یہ کیفی ساقی
تیری بھٹی کے سوا کوئی سہارا تو نہیں

گنہگار اور پھر مجھ سا خدائی میں نہیں کوئی
وہ عاصی ہوں کہ مجھ پر مغفرت کو ناز ہوتا ہے

عجب کچھ گومگو ہے داستان عشق بھی یارب
نہ مخفی بات رہتی ہے نہ افشا راز ہوتا ہے

عزلت گزین کوئے ملامت کو طرح   آسایش وطن بھی ہے لطف سفر بھی ہو
کیفی بلا رہا ہے انھیں تو جو اپنے گھر   اے خانماخراب کہیں تیرا گھر بھی ہو
فکر معاد ہے نہ تلاش معاش ہے   کھو یا گیا ہوں میں مجھے اپنی تلاش ہو
کیفی کے حال سے ابھی واقف کہاں ہو آپ   ہم خوب جانتے ہیں بڑا بدمعاش ہو

ترک الفت کا ارادہ قصد روپوشی بھی ہو   اور پھر دل میں تمنائے ہم آغوشی بھی ہو
شیخ صاحب پی بھی لو اک بار کہہ کر یاغفور   زہد کا یہ زہد ہے نوشی کی مے نوشی بھی ہو

کس کے دل میں کھب گئی کس کی نظر میں جچ گئی   میرے دل سی شئے خدا معلوم کس کو بیچ گئی
لے گئی سارے حواس اب نقد جاں پر دانت ہے   عرش تک آہ رسا کب میری بے لاج گئی
اب تو میخانہ میں کیفی ایک سناٹا سا ہے   وہ جھمیلا میکشوں کا اور وہ کھیچ بیچ گئی

وہ نہ آتے ہیں نہ آئینگے نہ آسکتے ہیں   ہم بھی کس وعدہ فراموش کی راہ تکتے ہیں

بگڑ کے حضرت دل آپ کیا بنا لیں گے   انھیں تو زعم ہو ہم روٹھ کر منالیں گے

سر آرایش دستار و ذوق شانہ رکھتے ہیں   طبیعت دار عاشق وضع معشوقانہ رکھتے ہیں

کام غیروں سے کوئی بنتا ہے   جس کا روٹھا اسی سے منتا ہے

بہت سے کام ہیں رہے حیات تھوڑی سی   سوانگ حد سے زیادہ ہیں رات تھوڑی سی

دل گم گشتہ کو ڈھونڈا کہیں پایا نہ گیا   وہ یہ کہتے ہیں یہاں کوئی تو آیا نہ گیا
ہائے ہم بھی کوئی انسان ہیں انسانوں میں   ہم سے روٹھا ہوا معشوق منایا نہ گیا
صدمہ ہجر بھی اک طرح کا احسان ہے مگر   وضعداروں سے ترے وہ بھی اٹھایا نہ گیا

شعر لکھنے کو قلم اٹھ نہیں سکتا کیفی   ہائے اب ہو گئے ہم کس قدر آرام طلب

امجد | اس دور کے ایک اور باکمال صاحب فن شاعر سید احمد حسین صاحب امجد ہیں جو اپنے رباعیات اور تضمینوں کے باعث مشہور رہیں مگر یہی ان کا کمال نہیں بلکہ ان کی نظمیں بھی بہترین جذبات کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

حضرت امجد کی شاعری حسن و عشق گل و بلبل کے جھوٹے تذکروں اور بے سروپا خیالی کرشموں سے خالی ہو جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

نہ ذکر بلبل و گل ہو نہ داستان بہار   نہ وصف سنبل و ریحاں نہ مدح باد شمال
نہ کوئی لطف زباں ہو نہ خوبی مضمون   نہ حسن و عشق کا قصہ نہ شاعرانہ خیال

سلہ رسالہ صفحہ

مگر تیسرا مصرع صرف مصنف کا خیال اور ان کا انکسار ہے۔ ورنہ مطالعہ سے معلوم ہوگا حضرت امجد کا کلام نہ صرف لطف زبان کی حیثیت سے واجب التعظیم ہے بلکہ خوبی مضمون کے اعتبار سے بھی قابل آفرین وتحسین ہے۔

یوں تو آپ کی تمام نظمیں اپنی طرز میں لاجواب اور بے مثل ہیں لیکن "جوش رحمت" "دنیا اور انسان" ماں اور بچی۔ میری تمری۔ اسنو لمپا۔ جنت کی ڈاک۔ قیامت صغریٰ دعائے یتیم۔ یاد شوہر۔ تصویریں خصوصیت کے ساتھ قابل صد آفریں و قابل داد ہیں۔

دنیا اور انسان ایک طویل نظم ہے جس میں دنیا اور اہل دنیا کی حرص و ہوا۔ طمع زر بغض وحسد کا نقشہ پاکیزہ روزمرہ میں نہایت خوبی اور عمدگی سے کھینچا ہے ؎

اب سنو غور سے اے مال پہ مرنے والو جھوٹ سچ بول کے اس پیٹ کے بھرنے والو
بلبلا پانی کا بن بن کے ابھرنے والو ناک چوٹی میں گرفتار سنورنے والو

آپ بیتی ہے یہ سب غیر کا افسانہ نہیں
قصۂ حمزہ نہیں حالت بیگانہ نہیں

وہ مسافر نظر آیا جو تمہیں صحرا میں سمجھو وہ تم ہی جو آئے ہو اس دنیا میں
شیر پھر دیکھا اچانک جو اسی اثنا میں نقشہ خوف کھچا مرد مکٹ بینا میں

چڑھ گیا شاخ پہ جس ڈر سے مسافر مضطر
اور یہ منہ کھولے ہوئے بیٹھ رہا زیر شجر

آپ کچھ سمجھے بھی کیا چیز ہے وہ شیر ژیاں قبر سمجھو کہ جو ہے منتظر ہر انساں
شیر سا قبر بھی ہے کھولے ہوئے اپنا دہاں کہ کسی روز تو آئے گا یہ جائے گا کہاں

اس کا سب ناز و نخرہ نہ بھلادوں تو سہی
ہڈیاں پیس کے چورا نہ بنا دوں تو سہی

عمر سمجھو اسے جس شاخ پہ اس نے جالی ملک الموت ہے وہ سانپ جناب عالی
رات دن چوہے ہیں جو کاٹ رہے ہیں ڈالی شہد کا چھتہ ہے دنیا سبب پامالی

وائے بر شامت اعمال مگس کے مانند
طمع شہد میں ہم ہوگئے بالکل پابند

نہ لحد کا کبھی بھولے سے خیال آتا ہے نفس بدکار نہ اعمال سے شرماتا ہے

حلق تک صبح و مسا لقمہ ترکھاتا ہے — چھوڑ کر دین کو دنیا کی طرف جاتا ہے

پھنس کے دنیا میں زر و مال کا ہو رہتا ہے

طلب جاہ میں کیا کیا غم و ہم سہتا ہے

ایک اور نظم "جوشِ رحمت"[1] کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

سنا ہے کہ اک شخص تھا خوش خصال — خدا ترس فرمانبر ذوالجلال

نہ بھاتا اسے کوئی دنیا کا کام — عبادت میں مصروف تھا صبح و شام

نکلتا نہ خلوت سے باہر کبھی — اٹھاتا نہ تھا سجدے سے سر کبھی

....

جگر غم سے جب تھام لیتا ہوں میں — تڑپ کر ترا نام لیتا ہوں میں

تسلی ہے میری ترے نام سے — نہ محروم کر رحمت عام سے

....

یہ مانا کہ بے حد گناہگار ہوں — سزا تو جو دے میں سزاوار ہوں

مگر کر نہ دور اپنی درگاہ سے — نہ منہ پھیر اس معذرت خواہ سے

ترا بندہ از من بہ افتد بسے

مرا چوں تو دیگر نیفتد کسے

نظم "قیامت صغریٰ"[2] امجد کی شاعری کا ایک زبردست نمونہ ہے یہ نظم طغیانی رود موسیٰ سنہ ۱۳۲۶ ہجری کے واقعہ پر لکھی گئی ہے جس میں حضرت امجد مع اپنے خاندان کے گرفتار بلا ہوئے تھے سوائے ذات امجد کے اُن کے خاندان کا کوئی دوسرا فرد اس طوفان بلا سے جانبر نہ ہو سکا ان واقعات نے اس نظم میں عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔

وہ رات کا سناٹا وہ گھنگھور گھٹائیں — بارش کی لگاتار جھڑی سرد ہوائیں

گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں — وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں

پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی

پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی

دم لینے کی طاقت نہ تھی ستانے کی تاب آہ — تھی زندگی خرد و کلاں نقش بر آب آہ

کرتی تھی الگ سیل رواں خانہ خراب آہ — طوطے کی طرح آنکھیں بدلتے تھے حباب آہ

---

[1] و [2] ریاض امجد

جان لینے کو ہر متنفس کے بڑھی تھیں
بے وجہ نہیں تیوریاں موجوں کی چڑھی تھیں

تاریکی میں دریا نے اک اندھیر مچایا — سیلاب قضا بن کے کیا سب کا صفایا
پاؤں سے گزرتا ہوا پھر سینہ تک آیا — آگے جو بڑھا موت نے بس حلق دبایا
شب بھر رہے سب پانی میں فوارے کے مانند
ہوتے ہی سحر ڈوب گئے تارے کے مانند

مادر کہیں اور پسر کہیں یاد پدر پر نم — بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم
عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم — کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیر اعظم
سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے
حیرت تھی کہ دن کو نظر آنے لگے تارے [۱]

اسی طرح ایک دوسری نظم "سنہلتا" سوز و گداز اور سلاست بیان کا بڑا اچھا نمونہ ہے:۔

مل کے اک دن شوہر و زن سات سات — کرتے تھے سنہلتا کی شادی کی بات
کہتے تھے افلاس میں ہیں مشکلات — آبروِ انساں کی ہے دولت کے ہات
زر تواند ذرہ را اختر کند
زر تواند قطرہ را دریا کند

پاس پردے کے تھی سنہلتا کھڑی — بات ان کی کان میں اس کے پڑی
آ گئی سناٹے میں اک دو گھڑی — لیک تھی بچپن میں فہمیدہ بڑی
سوچ کر کچھ آ گئی اپنی جگہ
آہ وہ غش کھا گئی اپنی جگہ

....

باپ پر ٹوٹے ستم میرے لئے — وہ اٹھائے رنج و غم میرے لئے
بنیں زنگو ہوں کم سے کم میرے لئے — بیچ کر گھر دے رقم میرے لئے
ان سے کہہ دے کوئی از راہ کرم
اب وہ بیٹی کا کریں کریا کرم

....

۱۔ ریاض امجد

سر پہ روغن ڈال کر جلنے لگی — شمع تھی کا فور کی گلنے لگی
زندگی کی دوپہر ڈھلنے لگی — ہاتھ غم سے موت بھی ملنے لگی
ہو گئی جل بھن کے ٹھنڈی شعلہ فام
چاند سی صورت ہوی آخر تمام

. . . .

ہو گئی برباد شاخ یاسمیں — خاک کی ڈھیری ہے سنبھلتا نہیں
خاک سے آتی ہے آواز حزیں — اے پدر برخیز د حال من ببیں
بشنو ایں خاکم حکایت می کند
او زر رسم بد شکایت می کند

ایک اور نظم "ایک بیکس کا خواب" بھی ملاحظہ کے قابل ہے جس میں اپنے خواب کے واقعات کو نہایت عمدگی کے ساتھ نظم کا جامہ پہنایا ہے واقعات جس حسن و خوبی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں وہ لایق داد ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

تھک کے جب لیٹ گیا رات کو میں بستر پر — چٹکیاں لینے لگا دل میں خیال مادر
ہو گیا پیش نظر ماں کی محبت کا سماں — پھر گیا سامنے آنکھوں کے گزشتہ منظر
وہ مسرت کا زمانہ وہ خوشی کی گھڑیاں — ہائے وہ انجمن عیش و طرب ہائے وہ گھر
غم کے آنسو کبھی آنکھوں میں اگر آجاتے — مردم دیدہ پکار اٹھتے کہ ہا ہر با ہر
چپہ چپہ تھا مرے گھر کا مقام عشرت — ذرہ ذرہ تھا مکاں کا فلک شمس و قمر

. . . .

ہو کے بے چین وہ جب درد سے چلاتی ہیں — کانپ اٹھتا ہے وہیں عرش خدائے اکبر
ہو گئیں نیند مری خوف سے آنکھیں فوراً — خانہ چشم سے باہر نہ نکلتی تھی نظر
سنتی چھوٹ گئی جسم میں دل کانپ اٹھا — رہ گیا صورت آئینہ میں ششدر ہو کر
پھر کھلی آنکھ تو آئی نظر اک تازہ بہار — دل کی پژمردہ کلی کھل گئی مثل گل تر
سامنے باغ ہے اور باغ بھی کیسا نایاب — جس کی تعریف سے قاصر ہو ہر اک جن و بشر

. . . .

فی الحقیقت یہ تری ماں ہو تو اس کا بیٹا — ہاتھ سے جائے نہ دامان خیال مادر

دھندلی ہونے لگی تصویر محبت ہے ہے ٹمٹے مٹتے نہ رہا کچھ بھی تو پھر اس کا اثر
آنکھیں پتھرائی ہوی رہ گئیں اک سکتے ہیں مردم دیدہ یہ کہنے لگے آنسو پی کر

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

"بزرگوں کی تعزیت بچوں کی نصیحت" بھی بڑی پاکیزہ نظم ہے:-

نیک دل نونہال نوعمرو حق تعالیٰ تمھیں رکھے خورسند
تم سلامت رہو ہزار برس تمھیں پہنچے نہ چشم بد سے گزند
ہم کو تم سے بہت امیدیں ہیں ہے بزرگوں کا تم سے نام بلند
کام ایسے کرو جو کام آئیں نہ بنو کھیل کود کے پابند
نے کے گھوڑوں پہ کیوں سوار رہو پھینکو ہمت سے آسماں پہ کمند
خاک کب تک اڑاوگے بچو یہ گھروندے بناوگے تا چند

....

عمر آتی نہیں ہے پھر جا کر زندگی ہے حباب کی مانند

....

پسران وزیر ناقص عقل بہ گدائی بہ روستا رفتند

ایک نوجوان بیوہ کے دردناک دلی جذبات کس خوبی و سلاست کے ساتھ نظم کیے گیے ہیں

یاد شوہر

کیا ہو گیا ہائے میرا والی برباد ہوا خوشی کا موسم
گھڑیاں و مسرت و طرب کی سب ہو گئیں مثل زلف برہم
تھا ایک زمانہ وہ بھی جس میں ہر طرح کا عیش تھا فراہم

....

وہ موسم گل وہ دور ساغر وہ رات وہ چاندنی کا عالم

....

اب خالی ہے پہلوے محبت سب ہو گیا کارخانہ برہم
وابستہ ہے گل کے ساتھ کانٹا ہے شادی و غم جہاں میں توام

پیارے! کیوں مجھ سے پھیر لی آنکھ — ہے ہے نہ ٹلی قضائے مبرم
کس پر مجھے چھوڑ کر سدھارے — اب کس کو دکھاؤں حالت غم
اٹھتا ہے دھواں دل و جگر سے — دم بھر نہیں تھمتی چشم پرنم
تم کرتے ہو باغ خلد کی سیر — دنیا ہے مرے لئے جہنم

"دعائے یتیم" اور "جنت کی ڈاک" بھی قابل دید نظمیں ہیں:۔

دعائے یتیم

ہر لحظہ چشم تر ہوں دن رات نوحہ گر ہوں — اتنی خبر نہیں ہے میں کون ہوں کدھر ہوں
ماتم میں وارثوں کے دنیا سے بے خبر ہوں — اس کمسنی میں ہے ہے بے مادر و پدر ہوں
ماں باپ سے ملا دے او آسمان والے

ظالم اجل نے بالکل تاراج کر دیا گھر — سب چل بسے عدم کو۔ اب باپ ہے نہ مادر
اب پیار کرنے والا کوئی نہیں ہو دم بھر — آنکھیں لگی ہیں میری مالک ترے کرم پر
ماں باپ سے ملا دے او آسمان والے

او آسماں ستمگر مجھ پر نہ یوں ستم کر — کم عمر خستہ جاں پر اب جور و ظلم کم کر
او باغبان قدرت شاخ الم قلم کر — بے وارثوں کے وارث بیکس پہ بھی کرم کر
ماں باپ سے ملا دے او آسمان والے

جنت کی ڈاک

اپنے بچوں کو اماں سنبھالو — خاک پر لوٹتے ہیں اٹھالو
تم جہاں ہو ہمیں بھی بلوا لو — اپنے زانو پہ دم بھر سلالو
پیاری اماں گلے سے لگالو

خاک پر ہم گریں تم اٹھالو — پھر بگڑ جائیں ہم تم منالو
ہم یتیموں کے دل کی دعا لو — پیار سے ہاں ذرا پھر بلالو
پیاری اماں گلے سے لگالو

امجد کی قادر الکلامی کا دلچسپ نمونہ بھی قابل داد ہے:۔

ہر اک ادا پر قرباں ہوں میں — ہاں ہر نظر میں حیراں ہوں میں
سینے کو دیکھوں گردن کو دیکھوں — عارض کو دیکھوں چتون کو دیکھوں

ابرو کو دیکھوں مژگاں کو دیکھوں؟ خمار زلف پیچاں کو دیکھوں
چشم سیہ کو دل میں جگہ دوں؟ ترچھی نظر کو آنکھوں میں رکھ لوں
ہو جاؤں صدقے سیب ذقن پر یا جان دیدوں شیریں دہن پر؟
رفتار محشر قامت قیامت ہے سر سے پا تک حسن و نزاکت
دل کس کو دیجے کس کو نہ دیجے دم زیر خنجر کس طرح لیجے
اشجار دیکھوں انہار دیکھوں کہسار دیکھوں گلزار دیکھوں
نجم و فلک کو مسجود سمجھوں شمس و قمر کو معبود سمجھوں
ہے ایک جلوہ سارے جہاں میں یاں اک مکیں ہے لاکھوں مکاں میں
اک پردہ میں ہے مسجود و ساجد واحد میں کل ہے اور کل میں واحد

دنیا کی بے ثباتی کے متعلق اسلوب بیان ملاحظہ ہوں:-

راہ خدا میں زندگی مستعار دے چھننے سے پہلے جامۂ ہستی اتار دے
بہر رفاہ خستہ دلاں اشتہار دے غم دیدہ دل کے کان میں امجد پکار دے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

اے جان! جان رنج میں کھوتی ہو کس لئے بے چین ضبط درد سے ہوتی ہے کس لئے
ناؤ اپنی بحر غم میں ڈبوتی ہو کس لئے اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

یہ قد راست بار مصائب سے خم سہی آفت پر آفت اور ستم پر ستم سہی
پاؤں میں چھالے دل میں خلش لب پہ دم سہی اے چلنے والے اور ذرا دو قدم سہی
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

مانا کہ تو شکستہ دل و خستہ حال ہے مانا کہ مثل نقش قدم پائمال ہے
مانا کہ ہجر یار میں جینا محال ہے دو دن فراق کے ہیں پھر آخر وصال ہے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

دیگر

عمر اک دن ہو کہ سو سال گزر جاتی ہے دوش پر کملی ہو یا شال گزر جاتی ہے
گر امیروں کی بہ اقبال گزر جاتی ہے بیکسوں کی بھی بہر حال گزر جاتی ہے

از ہوسہا بگزر یا مگزر میگزرد

خاک میں کاخ نشیں خاک نشیں یکساں ہو
بند کی آنکھ تو پھر زشت و حسیں یکساں ہے

پیٹ میں لقمۂ تر نانِ جویں یکساں ہو
آ گئی نیند تو پھر فرش و زمیں یکساں ہے

از ہوسہا بگزر یا مگزر میگزرد

جی نہیں چاہتا افسوس مگر مرنا ہے
گر نہیں خوف خدا موت سے تو ڈرنا ہو

مٹی پتھر سے غرض قعر شکم بھرنا ہے
جھونپڑی ہو کہ محل ہم کو بسر کرنا ہو

از ہوسہا بگزر یا مگزر میگزرد

حضرت امجد صوفی ہیں اور آپ پر ایسا مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے کہ آپ کی ہر ادا میں وہی عبودیت کا راز مضمر ہے آپ کا جدید کلام تمام تر تصوف سے مملو ہے۔ رحمتی وسعت کل شئی کے نام سے آپ کی ایک مثنوی ملاحظہ کے قابل ہے جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

ابتدائے آفرینش کی کلی
(یعنی میری چشم خفتہ) جب کھلی

رنج و راحت عیش و غم کچھ بھی نہ تھا
نور و ظلمت کیف و کم کچھ بھی نہ تھا

حضرت حق کے سوا کچھ بھی نہ تھا
ذات مطلق کے سوا کچھ بھی نہ تھا

دور دورہ تھا فقط تنزیہ کا
وہم بھی آنا نہ تھا تشبیہ کا

رفتہ رفتہ آنکھ جب کھلنے لگی
اس سے کچھ ملنے لگی صورت مری

حضرت حق سے تھا میرا اتصال
میں ہی تھا بے مثل کی پہلی مثال

میں ہی تھا مرآۃ حسن لایزال
دیکھتا تھا جس میں وہ اپنا جمال

....

عقل ان کو راہ پر لاتی نہیں
ضدی بچوں کو سمجھ آتی نہیں

تیز فطرت ہو گئی غفلت پسند
دیدۂ خفاش ہے ظلمت پسند

خوب ہی آپے سے باہر ہو گئے
آہ منزل پر پہنچ کر کھو گئے

میرے نصب العین ہو مرد اکرم
رحمۃ للعالمیں ہے میرا نام

فیض بخش کل نبی آدم ہوں میں
سر سے پا تک رحمت عالم ہوں میں

اے گنہگارو نہ گھبراؤ ذرا
منفعل ہو کر ادھر آؤ ذرا

رحمۃ للعالمیں ہوں آؤ آؤ
میں شفیع یوم دیں ہوں آؤ آؤ

شامل ہر ذرہ ہے رحمت مری   امتی لا تقنطوا من رحمتی

میرا مکان

تن کا حصار کھینچا دل کا مکاں بنایا
دروازہ عقل کا اک اس میں عجب لگایا

ڈالا خیال کا اک اس پر لطیف پردہ
جس کو بنا کے درباں دروازہ پر بٹھایا

خون جگر سے میرے رنگیں محل بنا کر
نور نظر کا اس میں روشن دیا جلایا

جب اس طرح سے بن کر تیار ہو گیا گھر
پھر روح بن کے اس میں خود آپ ہی سمایا

چھپ کر کہیں وہ ہم سے باہر نہیں گیا ہے
وہ بحر حسن و خوبی کوزے میں ہے سمایا

وہ بادشہ عالم شہ رگ سے بھی قریں ہے
قرآں میں خود اس نے اپنا پتہ بتایا

شکل حصار بالکل سایہ مکان کا ہے
اس عکس ہی سے ہم نے شخصی نشاں بنایا

اس کا وجود ہم میں موجود اگر نہیں ہے
سب نے ہمارے آگے کیوں اپنا سر جھکایا

امجد نے جستجو میں دنیا کی خاک چھانی
اپنے مکان ہی میں اس کا نشان پایا

تضمین ملاحظہ ہو:-

فرقت میں جاں برباد ہے آیا ہے آنکھوں میں دم
جا کر سنائے کون انھیں افسانۂ بیمار غم

پیغامبر ملتا نہیں بے چارہ و بے کس ہیں ہم
ان تلت یا ریح الصبا یوما الی ارض الحرم

بلغ سلامی روضة فیه النبی المحترم

کیا شکل کھینچی واہ وا قرباں ترے دست قضا
پڑھتے ہیں جس کو دیکھ کر حور و ملک صل علیٰ

کیا رنگ ہے کیا روپ ہے کیا حسن ہے نام خدا
من وجهه شمس الضحیٰ من خده بدر الدجیٰ

من ذاته نور الهدیٰ من کفه بحر الهمم

کیا پوچھتے ہو ہمدمو! ہم سے محبت کا مزا
دل چاک ہے ٹکڑے جگر تن زخمی تیغ جفا

سننا وہاں زخم سے رہ رہ کے آتی ہے صدا
اکبادنا مجروحة من سیف هجر المصطفیٰ

طوبیٰ لاهل بلدة فیها النبی المحترم

پیراہن دل چاک ہے ٹکڑے ہے جیب آستیں
جینے سے جی بیزار ہے ہونٹوں پہ ہے جان حزیں

اچھے مسیحا! بے رخی بیمار سے اچھی نہیں
یا رحمة للعالمین ادرک لزین العابدین

محبوس ایدی الظالمین فی الموکب المزدحم

دیگر

چھپایا لاکھ مگر چھپ سکا نہ عشق کا راز   تمام حالت دل تاڑ ہی گئے دم ساز
تری خطا نہ مرا جرم اے بت طناز   ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز
وگرنہ عاشق و معشوق راز دار انند

تڑپتی ہے تری فرقت میں خلق شام و سحر   کوئی حزیں کوئی بیتاب کوئی خاک بسر
تجھے نہیں ہے مگر اپنے عاشقوں کی خبر   بزیر زلف دو تا چوں گذر کنی بنگر
کہ از یمین و یسارت چہ بے قرار انند

پھڑک رہے ہیں اسیران کاکل مشکیں   نکلنے کو ہے تن مضمحل سے جان حزیں
جو میری بات کا ظالم تجھے یقین نہیں   گزار کن چو صبا بر بنفشہ زار و بہ بیں
کہ از تطاول زلفت چہ سوگوار انند

ہے ہم سے نور فزا شمع مغفرت پر تو   سیاہ کاروں سے ہے آفتاب عفو میں ضو
شراب خواروں سے کوثر کو ہے لگی ہوئی لو   نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو
کہ مستحق کرامت گناہگار انند

ترے خیال میں مرجائے امجدؔ ناشاد   الٰہی یوں ہی رہے خاک عاشقاں برباد
دل حزیں نہ ہو غم سے ترے کبھی آزاد   خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد
کہ بستگان کمند تو رستگار انند

دیگر

دو عالم میں ہے اک شہرہ ترے حسن مجدد کا   خدائے دو جہاں کرتا ہے نظارہ ترے قد کا
مرا آب و گل سے ہے ہیولا ذات ارشد کا   محمد مصطفےٰ ! پتلا ہے تو نور مجرد کا
ہوا خورشید اقلیم عدم سایہ ترے قد کا

خلش میری طرف سے دوستو دل میں نہ آنے دو   طبیعت آزمائی کچھ نہیں اس میں جو سچ پوچھو
یہ کب منشا تھا میرا شاعرانہ کوئی جدت ہو   یہ مجبوری ہی لکھا الیہ کی صورت لفظ اللہ کو
نہ آیا ہاتھ اچھا قافیہ جب کوئی احمد کا

نہیں ذات احد کچھ دور احمد کی حقیقت سے   الف اللہ کا ملتا ہے بالکل تیری قامت سے
مقدم ہے تری تکوین لفظ کن کی خلقت سے   کبھی پہلے تری تصویر ازل میں مست قدرت سے

ہوا لفظ خدا سے اشتقاق اول ترے قد کا

فلک کو چاند تاروں سے زمیں کو گل سے زینت دی ۔۔۔ عطا کی لہلہاتے کھیت سے جنگل کو سر سبزی
مٹایا داغ کثرت شمع وحدت کو ضیا بخشی ۔۔۔ خدا نے زیب و زینت کی جو بزم اک آفرینش کی

لگایا اس میں قد آدم آئینہ ترے قد کا

شعاع مہر خاور کا چلے جب حلق پر خنجر ۔۔۔ بغل میں ہو ہر اک کے نامہ اعمال کا دفتر
کھرے کھوٹے کی جب ہو جانچ پیش حضرت داور ۔۔۔ برنگ زر چڑھے سونا مرا میزان محشر پر

اٹھوں میں قبر سے ممنور تیری چشم اسود کا

پیام یار لائے روشنائی میرے نامے کی ۔۔۔ کوئی جدت دکھائے روشنائی میرے نامے کی
لطافت ایسی پائے روشنائی میرے نامے کی ۔۔۔ الٰہی پھیل جائے روشنائی میرے نامے کی

بڑا معلوم ہو لفظ احد میں میم احمد کا

اب ہم امجد کی رباعیات کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کے اظہار کے لئے ہمیشہ زیادہ موزوں اور اصناف شاعری میں اہم چیز رباعی تصور کی گئی ہے شیخ ابو الخیر ابو سعید۔ امام غزالی۔ سحابی۔ عمر خیام نے ہمیشہ رباعی میں طبع آزمائی کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ فلسفی و اخلاقی نکات کے بیان کرنے کے لئے کوئی موزوں چیز سوائے رباعی کے نہیں ہے۔ جس خوبی و عمدگی کے ساتھ شاعر اپنے مافی الضمیر کو ادا کر سکتا ہے وہ رباعی کا ہی حصہ ہے مگر صاحب فن اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ رباعی میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کوئی آسان امر نہیں ہے بلکہ فن شعر میں نہایت مشکل اور دشوار ترین امر ہے کیونکہ چار مصرعوں میں مضمون کو ادا کرنا اور پھر چوتھا مصرع ایسا ہونا ضرور ہے جو تینوں مصرعوں کا نچوڑ ہو۔ درحقیقت رباعی کا کہنا سنگ لاخ زمین سے جوئے شیر کا لانا ہے یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ امجد دنیائے سخن کی اس (رباعی) اقلیم کے بادشاہ ہیں۔ حضرت گرامی نے کیا خوب کہا ہے:۔

امجد بہ رباعی ست فرد امجد ۔۔۔ کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز ۔۔۔ روح سرمد بگفت امجد امجد

رباعیات کے چند نمونے پیش ہیں:۔

(۱)

صنعت تری ہر خار دکھاتا ہے
ہر غنچۂ گل تیری صدا دیتا ہے
ہر اصل ۔ اصول معرفت ہے یارب
پتہ پتہ ترا پتہ دیتا ہے

(۲)

واجب ہی کو ہے دوام باقی فانی
قیوم کو ہے قیام باقی فانی
کہنے کو زمین و آسمان سب کچھ ہے
باقی ہے اسی کا نام باقی فانی

(۳)

ضایع فرمانہ سرفروشی کو مری
مٹی میں ملا نہ گرم جوشی کو مری
آتا ہوں کفن پہن کے اے رب غفور
دھبہ نہ لگے سپید پوشی کو مری

(۴)

پیک اجل خانہ خراب آتا ہے
بر باد کن شیب و شباب آتا ہے
اے ملک عدم کے جانے والو ٹھیرو
اک آبلہ پا بھی ہم رکاب آتا ہے

(۵)

معبود کی شان عبد میں پاتا ہوں
تنزیہ سے تشبیہ کی سمت آتا ہوں
کلمہ میں خدا کے بعد ہے نام نبی
کعبہ سے مدینے کی طرف جاتا ہوں

(۶)

رخ مہر ہے قد خط شعاعی کی طرح
ہے گلہ امت میں وہ راعی کی طرح
اُس خاتم انبیا کا آخر میں ظہور
ہے مصرع آخر رباعی کی طرح

(۷)

ہر گام پہ ٹھکر کے گرا جاتا ہوں
نقش کف پا بن کے مٹا جاتا ہوں
تو بھی سنبھال میرے لینے والے
میں بار امانت میں دبا جاتا ہوں

(۸)

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی
طاعت میں نہیں ہے خود نمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو
حضرت! تم نے دیا سلائی اچھی

(۹)

گردش میں یہ گرد باد آخر کب تک
طرح کون و فساد آخر کب تک
ٹوٹے گا طلسم مادیت اک دن
اضداد میں اتحاد؟ آخر کب تک

(۱۰)

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں
پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

(۱۱)

اس بوڑھے امیر سے فقیر اچھا ہے
اس نیک سرشت سے شریر اچھا ہے
ہے ایسے سہاگ سے رنڈاپا بہتر
پہلو میں مرے پیر سے تیر اچھا ہے

(۱۲)

کثرت میں جمال پاک وحدت دیکھو
عسرت میں ہے صاف نقش عشرت دیکھو
دنیا میں رہے عالم دیں پیش نظر
آئینہ ہے اس لئے کہ صورت دیکھو

مر مر کے لحد میں نے جا پائی ہے
یاں تک مجھے تیری ہی کشش لائی ہے
(۱۳)
آ۔ اے مرے منہ چھپانے والے آ جا
خلوت ہے شب تار ہے تنہائی ہے

سانچے ہیں اجل کے ہر گھڑی ڈھلتی ہے
ہر وقت یہ شمع زندگی جلتی ہے
(۱۴)
آتی جاتی ہے سانس اندر باہر
یا عمر کے حلق پہ چھری چلتی ہے

ہر ذرہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے
اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
(۱۵)
اصنام دلی زباں سے یہ کہتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

دنیا دار الثبات دنیا میں نہیں
اک لحظہ قرار موج دریا میں نہیں
(۱۶)
عالم کا وجود صورت لا سمجھو
لفظاً موجود اور معنی میں نہیں

شمشیر محبت پہ گلا رہنے دے
ہاں جان کے ساتھ یہ بلا رہنے دے
(۱۷)
امجدؔ شب ہجر ہیں نہ کر بند آنکھیں
وہ آئے گا دروازہ کھلا رہنے دے

ذہینؔ | سید غلام مصطفےٰ صاحب ذہینؔ بھی اس دور کے ایک نام آور اور مشہور شاعر ہیں آپ کا کلام بھی عشق و عاشقی گل و بلبل کے افسانوں سے پاک ہے۔ عموماً اخلاقی مضامین آپ نظم کرتے ہیں کلام کے ملاحظہ سے معلوم ہوگا کہ الفاظ صاف شستہ ترکیبیں دل نشین ہوتی ہیں مسلسل نظمیں جن میں قوت فکر کا پورا امتحان ہوتا ہے بہت اچھی لکھتے ہیں۔ زن بدخو۔ اقوال مسلمہ وغیرہ قابل قدر ہیں۔ ہندوستان کی اخباری دنیا میں آپ اپنی بہترین نظموں کے باعث شہرت [illegible] رکھتے ہیں۔ معرفت اور تصوف میں بھی آپ طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ بہرحال جنوبی ہند کی ترقی اردو میں آپ کا بھی حصہ ہے۔

انسان

او بشر او خاک کے پتلے تجھے اتنا غرور
تیرے ہم جنس اور پھر تو ہی ہے ان سے نفور

نشۂ زر نشۂ رز کی طرح کیوں چڑھ گیا
ہوگئی الٹی سمجھ کیوں کیا ہوا تیرا شعور

کر خدا کا شکر کیا تھا کیا سے کیا تو ہو گیا
جو ہو کرنا آج کر لے کل تو ہے روز نشور

ہو کے انساں پھر کرے تو ہی جفا انسان پر
کیا یہی ہے آدمیت کا شعار اے بے شعور

محنت

محنت کرو تو ہوگی محنت سے دور کلفت
محنت کرو ملے گی محنت کے بعد راحت

کیا علم و فضل و حکمت کیا مال و جاہ و دولت
حاصل ہوں نعمتیں سب محنت ہی کی بدولت

محنت سے جی چرانا یہ پست ہمتی ہے — بنتے ہیں کام اس سے لیکن بشرط ہمت
عادت کرو تم اس کی ہیں فائدے بہت کچھ — قسمت میں کاہلوں کی مقسوم ہے فلاکت
محنت کے فائدوں کو اک محنتی سے پوچھو — سستی کی دیکھتے ہو تم رات دن مضرت

شیریں کلامی

عجب چیز ہے تو بھی شیریں کلامی — کہ شیدا ہے تجھ پر ہر اک خاص و عامی
مٹاتی ہے رنج و غم و تلخ کامی — بناتی ہے دنیا میں لوگوں کو نامی
بن آتے ہیں سب کام تجھ سے جہاں کے
تجھی سے ہیں دل شاد خرد و کلاں کے

ترے دم سے دنیا میں خلق و مروت — ترے خلق سے لطف و اکرام راحت
ترے لطف سے فیض و جود و عنایت — ترے فیض سے رحم و انسان رحمت
تری رحمتیں سایہ گستر جہاں پر
ترا سایہ ظل ہما سے ہے بڑھ کر

یہ جاہ و زر و مال کچھ بھی نہیں — یہ دور روزہ اجلال کچھ بھی نہیں
ہمیشہ کسی کا نہیں ایک حال — یہ اعزاز و اقبال کچھ بھی نہیں
یہاں کی نہیں نعمتیں دیر پا — دوشالے ہوں یا شال کچھ بھی نہیں

.... — ....

فریدوں کہاں ہے سکندر کہاں — کہاں جم ہے تیمور و اکبر کہاں
کہاں ہے وہ محمود نادر کہاں — کہاں ہے وہ مامون و سنجر کہاں
کہاں ہے فلاطون سا وہ فلسفی — ارسطو سا وہ علم پرور کہاں
کہاں ہے وہ بہمن سا جنگ آزما — وہ رستم سا ہے زور آور کہاں
کہاں ہے وہ لیلیٰ شیریں ادا — وہ شیریں سی ہے ماہ پیکر کہاں
کہاں معن و حاتم سے باذل سخی — ولی تو ولی ہیں پیمبر کہاں
نشاں مٹ گئے نامیوں کے دریغ — فقط نام ہے نام آور کہاں
جہاں اے برادر نہ ماند بہ کس
دل اندر جہاں آفریں بند و بس

سب ہیں فانی کیا زمیں کیا آسماں کچھ بھی نہیں — اک خدا کو ہے بقا دونوں جہاں کچھ بھی نہیں

کرتی ہے عیب و ہنر کو آشکارا گفتگو — جوہر انساں کا ہے آئینہ گویا گفتگو

زندگانی کا زمانہ میں بھروسا کیا ہے — جز فنا ہونے کے انسان میں رکھا کیا ہے

بھلائی کیے جا شرافت یہی ہے — اطاعت یہی اور طاعت یہی ہے

نکوئی میں کر نام شہرت یہی ہے — بھلائی کے کر کام راحت یہی ہے

سخت دشوار ہے انساں کی پہچان ذہین — دوست کہتے ہیں کسے آپ نے سمجھا کیا ہے

چشم کرم بشر سے ذلت کا سامنا ہے — اللہ سے طلب کر جو تجھ کو مانگنا ہے

عطا کر قناعت کی دولت کریم — نہیں مجھ کو قاروں کا زر چاہیئے

ہر اک کام میں کیجے پہلے سعی — پھر اس کا خدا سے ثمر چاہیئے

حیات خضر کی سی نعمت ملی — پھر اب کیا تجھے اے بشر چاہیئے

سنتے تھے لامکاں ہے یارب مکان تیرا — ڈھونڈا جو اپنے دل میں پایا نشان تیرا

شمس و قمر ہیں تیرے اور بحر و بر ہیں تیرے — ہے یہ زمین تیری آسمان تیرا

ہو گبر یا ہو ترسا ہو شیخ یا برہمن — سب کا ملاذ و مامن ہے آستان تیرا

دیر و حرم کو سمجھو کیوں کر جدا جدا میں — یہ بھی مکان تیرا وہ بھی مکان تیرا

باقی | راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت حیدرآباد کے خاندانی امیر اور باکمال تھے آپ کا اردو اور فارسی کلام شائع ہو چکا ہے اردو دیوان جو "بقائے باقی" سے موسوم ہے اگرچہ مختصر ہے لیکن کلام کی خوبی کے باعث ممتاز ہے نمونہ کلام درج ہے:-

ہے دگرگوں رنگ اس محفل میں خاص و عام کا — دور ساغر ہے نمونہ گردش ایام کا

گوشۂ عزلت میں تنہا ہوں میں عنقا کی طرح — خلق میں شہرہ ہے گمنامی سے میرے نام کا

مرغ دل کو دیتی ہے دانے کا دھوکا مردمک — حلقہ چشم صنم بنتا ہے حلقہ دام کا

چشم میگوں کا ترے ساقی جب آتا ہے خیال — خوں رلاتا ہے مجھے محفل میں ہنسنا جام کا

میں وہ دیوانہ ہوں کعبے میں جو آتا میرے ہاتھ — تار بھی باقی نہ رکھتا جامۂ احرام کا

ولہ

بس آتے ہی اب روٹھ کے جانا نہیں اچھا — جانا نہیں اچھا ہے یہ جانا نہیں اچھا

پازیب کی آواز سنانا نہیں اچھا — سوتے ہوئے فتنوں کو جگانا نہیں اچھا

کیا آپ ہی عالم میں ہیں شمشیر زن ابرو
میں بد ہی ہی آپ نے سمجھا جو مجھے بد
کیا قدر تمھاری کوئی باقی کرے افسوس

ہر وقت یہ ابرو کا چڑھانا نہیں اچھا
اچھا نہیں میں تم نے جو جانا نہیں اچھا
تم اچھے ہو لیکن یہ زمانہ نہیں اچھا

ولہ

خون کرنا جو نہ تھا آرزوں کا میری
سرخ دامن جو ہی قاتل کا قیامت کے دن
خوف باقی تجھے عصیاں سے ہی کیوں وہ ہی رحیم

سرخ کیوں مجھ کو پھر اس شوخ نے بھیجا کاغذ
وہی محضر ہے وہی ہی مرے خوں کا کاغذ
بے خطر ہونے دے اعمال کا کالا کاغذ

ولہ

لے گا خضر کو اپنا پتہ کب
محبت میں ہوئے رسوائے عالم
مبارک شیخ صاحب کو عمامہ
یسر فیض صاحب سے ہیں استاد
مقام اپنا ہے باقی بے مقامی

رواں ہیں صورت ریگ رواں ہم
جہاں ہنستا ہے روتے ہیں جہاں ہم
اٹھائیں گے یہ بار گراں ہم
دکن سے جائیں کیوں ہندوستاں ہم
مکاں رکھتے نہیں جز لامکاں ہم

ولہ

گریباں چاک ہی جو گل نظر آتا ہی گلشن میں
وہ صرف آرایش محفل ہی یہ ہی زینت عالم
فزوں تر مجھ کو زنداں سے ہوا جامہ تعلق کا

ذرا سوچو تو کیا تاثیر ہی بلبل کے شیون میں
بہت ہے فرق وئے یار میں اور شمع روشن میں
گریباں طوق سے بھاری ہوا ہی میری گردن میں

ولہ

سب سمجھتے اور ہیں حالت ہماری اور ہی
عالم ہستی میں کیا دم لے بشر اے ہمدمو
زخم ظاہر پر لگا مرہم تو اس سے فائدہ

اور بیماری ہی کچھ بیمار داری اور ہے
آگے اس رہ رو کو منزل اس سے بھاری اور ہے
پہلو دل میں نہاں اک زخم کاری اور ہے

عزیز یار نواب محمد عزیز الدین خاں عزیز یار جنگ بہادر حیدر آباد کے امیر اور با مذاق شاعر ہیں۔ کلام دلچسپ اور دل آویز ہوتا ہی۔ کلام کی شستگی و صفائی قادر الکلامی کے شاہد ہیں ایک ضخیم دیوان شایع ہو چکا ہے دوسرا زیر ترتیب ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

حسن پر راز ازل سے دل مرا دیوانہ ہی
پھول پر بلبل ہے شمع بزم پر پروانہ ہے

بادۂ وحدت سے پُر دل کا مرے پیمانہ ہے ۔۔۔ نعرۂ اللہ اکبر نغمۂ مستانہ ہے
گرد کلفت سے مُعرا شست و شوسے بے نیاز ۔۔۔ میری عریانی بھی گویا خلعت شاہانہ ہے
یاالٰہی ہو نہ جائے حشر کا دن مختصر ۔۔۔ سرگزشت عمر کا میری بڑا افسانہ ہے
ساقی پیماں شکن پر میکشوں کا زور کیا ۔۔۔ گردش تقدیر گویا گردش پیمانہ ہے
برق کا بھی خوف مجھ کو با دصرصر سے بھی ڈر ۔۔۔ آڑے سیدھے چار تنکے نام کا کاشانہ ہے
منتظر ہیں بادہ کش باران رحمت کے عزیز ۔۔۔ سامنے شیشہ دھرا ہے ہاتھ میں پیمانہ ہے

اضطراب دل و جگر دیکھو ۔۔۔ لوٹتے ہیں ادھر ادھر دیکھو
دل مرا دیکھ کر جگر دیکھو ۔۔۔ اس کی اس کو نہ ہو خبر دیکھو
دھجیاں ہیں مری گریباں کی ۔۔۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھو
راز غیروں پہ آشکار نہ ہو ۔۔۔ میں ادھر دیکھوں تم ادھر دیکھو
بے وفا کون باوفا ہے کون ۔۔۔ ذرا تم دل میں سوچ کر دیکھو
دیکھتا ہوں نگہ ناز کو میں ۔۔۔ تم ادھر دیکھو یا ادھر دیکھو
بت کدہ سے اٹھو عزیز چلو ۔۔۔ دوسرا اور کوئی گھر دیکھو

مخمس

بر غزل اعلیٰحضرت قدر قدرت آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ

کہاں تک آہ کرے بار بار مشکل ہے ۔۔۔ کہاں تک آنکھ رہے اشکبار مشکل ہے
کہاں تک اور بڑھے انتظار مشکل ہے ۔۔۔ نہاں نظر سے ہوا روئے یار مشکل ہے
اب اپنے دل پہ ہمیں اختیار مشکل ہے

کسی کے طرۂ زلف دراز نے دل پر ۔۔۔ کسی کے عشوۂ جادو طراز نے دل پر
کسی کے شیوۂ راز و نیاز نے دل پر ۔۔۔ کسی کے غمزہ انداز و ناز نے دل پر
کئے وہ ظلم کہ جس کا شمار مشکل ہے

نہ اس طرح سے یکایک ہوا تباہی تھی ۔۔۔ ذرا ہماری محبت بھی آزمانی تھی
ابھی امنگ کے دن تھے ابھی جوانی تھی ۔۔۔ غم رقیب میں تم کو نہ خاک اڑانی تھی
ہمارے دل سے یہ جائے غبار مشکل ہے

ہزاروں گو ہر مقصود کے ہیں گنج جہاں ۔۔۔ مثال سیب ذقن ہے ہر اک ترنج جہاں

جہاں نہ خوف کسی بات کا نہ رنج جہاں میں اس چمن کا ہوں مرغ ترانہ سنج جہاں
ترا گزر بھی نسیم بہار مشکل ہے

کبھی بلا کے کبھی آپ جا کے دیکھ لیا گلے لگا کے محبت جتا کے دیکھ لیا
عدو کے سر کی قسم بھی دلا کے دیکھ لیا ہزار بار تمھیں آزما کے دیکھ لیا
تمہارے وعدوں کا اب اعتبار مشکل ہے

چمن میں ایک قیامت ہے مرغ جاں کیلئے قدم قدم پہ مصیبت ہے مرغ جاں کے لئے
کہاں نصیب فراغت ہے مرغ جاں کیلئے نگاہ ناز اک آفت ہے مرغ جاں کے لئے
یہ تیر وہ ہے کہ جس سے فرار مشکل ہے

عجیب چیز ہیں دنیا میں حضرت انساں کہ جس کے ہو گئے پر اس کو چھوڑتے ہیں کہاں
عزیز بھی ہے ازل سے مرید پیر مغاں پڑھی ہے بادۂ تر کی جو چاٹ لے عثماں
بہار گل میں یہ جائے ہزار مشکل ہے

ولہ

ہوس دولت دنیا بھی بلا ہوتی ہے جتنا کم کیجئے اتنی یہ سوا ہوتی ہے
ان حسینوں کی عجب طرز جفا ہوتی ہے روٹھنے میں بھی لگاوٹ کی ادا ہوتی ہے
تھام لیتا ہے وہی بڑھ کے مجھے دست سبو بے خودی میں جو ذرا لغزش پا ہوتی ہے
بے وفائی کی محبت میں شکایت کیسی جیسی ہوتی ہے خطا ویسی سزا ہوتی ہے
نہ رہی اب تو کسی بات کی الجھن دل میں جنبش دست مژہ عقدہ کشا ہوتی ہے
بے کسی قابل عبرت ہے مریض غم کی نہ دعا کرتا کوئی نہ دوا ہوتی ہے
نیند آجاتی ہے آنکھوں میں دم ذبح عزیز دامن تیغ کی کیا خوب ہوا ہوتی ہے[1]

مضمون کی غیر ضروری طوالت کے خوف سے اب میں چند شاعروں کا صرف نہایت مختصر نمونہ کلام پیش کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ اس مضمون میں ارادہ سے زیادہ طوالت ہو چکی ہے۔ ناظرین اس مختصر نمونہ کلام سے بھی اس امر کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ خوبی مضمون سلاست زبان۔ فصاحت کلام۔ جذبات بندش وغیرہ کے لحاظ سے ان صاحب کی خدمات کس حد تک قابل داد ہیں۔

---

[1] از دیوان عزیز غیر مطبوعہ

سیّد جلال الدین توفیق

حجاب دل میں داغ شوق بے ساماں نکلتا ہے ۔۔۔ کہ شعلہ پردۂ فانوس میں عریاں نکلتا ہے
خیال بے خودی تک بھی نوید مرگ حسرت ہے ۔۔۔ مراغم پردۂ مشکل میں بھی آساں نکلتا ہے
ملی ہو فطرت توام نہ دونوں کو کہیں یارب ۔۔۔ نکل آتا ہے دل بھی ساتھ جب ارماں نکلتا ہے
محبت ہے کسی کی دل نشین جوش بے تابی ۔۔۔ حجاب شوق میں ہر مدعا پنہاں نکلتا ہے
کہاں تک پہنچی ہے مشق امتحان ناوک حسرت ۔۔۔ جگر میں ڈوب کر دل سے سر پیکاں نکلتا ہے
نہ ہو توفیق کیوں مشکل میں کوشش چارہ سازی کی ۔۔۔ کہ دل سے خار حسرت بھی کہیں آساں نکلتا ہے

پس مرگ بھی تو ہجوم غم رہا میری حالت زار پر ۔۔۔ کبھی اس پر اشک بہا گیا کبھی شمع روئے مزار پر
تن زار پر مرے داغ کا کچھ عجب طرح کا ہجوم ہے ۔۔۔ کہ عجب طرح کی بہار ہے کہیں گل شگفتہ ہے خار پر
میں خیال خنجر ناز سے تر بے بچ گیا بھی تو کیا ۔۔۔ تری یاد قامت دلربا مجھے کھینچ ڈالے ہے دار پر

جب تک ہے جواں ہشیار رہے پیری میں گزاری غفلت ۔۔۔ رات تو ساری جاگ کے کاٹی سحر کو آرام کیا

ساقی تری شراب تو شیشہ میں تھی بھری ۔۔۔ ساغر میں آکے اور بھی سانچے میں ڈھل گئی

ترکیب بند

جہاں میں زہد جب تک پیشۂ زہاد ہو یارب ۔۔۔ ہر اک زاہد کے دل میں تیری جب تک یاد ہو یارب
حسینوں کی ادا تا مایل بیداد ہو یارب ۔۔۔ لب عشاق پر تا مشکل نے فریاد ہو یارب

جہاں میں میر محبوب علی خاں شاد ہو یارب
رہے آباد جب تک جہاں آباد ہو یارب

افق سے تا عیاں ہر صبح نور صبحگاہی ہو ۔۔۔ سواد شام کو تا کاروان مہر راہی ہو
جہاں میں تا وجود شب ہوا اور شب میں سیاہی ہو ۔۔۔ فلک پر ماہ اور تحت زمیں تا جائے ماہی ہو

جہاں میں میر محبوب علی خاں شاد ہو یارب
رہے آباد یہ جب تک جہاں آباد ہو یارب

رہے بلبل کو الفت گل سے اور تا گل کو بلبل سے ۔۔۔ رہے سرمست ہر اک بادہ کش تا شیشۂ مل سے
صبا جھاڑا کرے تا صحن گلشن زلف سنبل سے ۔۔۔ رہے تا دام میں صید سخن مضمون کاکل سے

جہاں میں میر محبوب علی خاں شاد ہو یارب
رہے آباد یہ جب تک جہاں آباد ہو یارب

پڑ گئے پیچ نزاکت سے کمر میں لاکھوں — گل جو دامن میں سنبھالے ہوئے اٹھا سہرا
دی جگہ پہلوئے ارمان میں لپٹی بدھی — سر چڑھایا تو بندھا ہار گلے کا سہرا
ایسا الجھا کہ ہوا ساتھ چھڑانا مشکل — مل کے سر پیچ سے کس پیچ میں آیا سہرا
سر چڑھا کر اسے نوشاہ نے دی جو عزت — ایسا پھولا کہ نہ جامے میں سمایا سہرا
بن کے خورشید جو شادی کا ستارہ چمکا — خندۂ صبح تمنا نظر آیا سہرا
اس کے دیکھے سے نہ کیوں آنکھیں ہوں پرنور کہ ہو — خانۂ حسرت وارماں کا اجالا سہرا

پھول سہرے کے تر و تازہ رہیں دل کی طرح
تا قیامت رہے توفیق شگفتا سہرا

قطب الدین تسلی

درد سے بڑھ کے کھٹکتا ہے یہ کانٹا دل میں — سو بلائیں ہوں نہ ہو ایک تمنا دل میں
آپ کا بھی کبھی اس گھر میں ہوا تھا آنا — داغ فرقت نہیں ہیں نقش کف پا دل میں
غم کا پتلا ہوں میں کس طرح تسلی کہہ دوں — ٹیس تو میرے کلیجے ہی میں ہے یا دل میں

عشق میں دیکھئے ایمان رہے یا نہ رہے — اس کا اللہ نگہبان رہے یا نہ رہے
کیوں رکیں فتنہ گری سے تری کافر آنکھیں — کوئی دنیا میں مسلمان رہے یا نہ رہے

غیر کے ساتھ وفا اور وفا بھی اتنی — آپ تو شوخ بھی مشہور تھے ہرجائی بھی
نام لے کر مرا بدنام ہوئی ناموری — ساتھ دے کر مرا رسوا ہوئی رسوائی بھی

بھرے بیٹھے ہیں وہ تیوری چڑھائے خیر ہو دیکھیں — یہ بجلی کس پہ گرتی ہے گھٹا کس پر برستی ہے
تسلی قدر کی امید تم کو اور پھر کن سے — خیالوں میں تو کیا جن کی نگاہوں میں بھی پستی ہے

دنیا میں کیا ہے جس کی تمنا کرے کوئی — ہاں تو اب ایک تو ہے اگر لے وفا نہ ہو

یہ پاس ضبط تھا رک رک گئے آ آ کے آنکھوں میں — ہمارے آنسوؤں نے منہ کبھی دیکھا نہ دامن کا

بے کسی ہیں کون کس کا ساتھ دیتا ہے یہاں — چھٹ گئے دامن سے میرے خار دامنگیر بھی

محمد عبدالحی باَزغ

خود فراموشی کا عالم مجھ پہ تھا چھایا ہوا — اس طرح سے میں تری محفل میں تھا گویا نہ تھا
وہ چلے چلے سخن کے جو تھے لازم سخن — باَزغ نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے دیوان میں کہہ لئے

موت کا مجھ پہ ہے احسان کہ آئی شبِ وصل — غم سے میں چھوٹ گیا فکر سحر ہی نہ رہی
اثر کا میرے نالوں نے نشاں تک بھی نہیں پایا — گئے عرشِ بریں تک اور ساتوں آسماں ڈھونڈے
خیال یار کو ہم ڈھونڈھتے تھے وقت خواب ایسا — پرندہ جیسے رات آتے ہی اپنا آشیاں ڈھونڈے
خواب میں بھی کبھی راحت کی نہ صورت دیکھی — رنج سہنے ہی کو پیدا میں ہوا ہوں شاید
ہم نے لب ساحل جو کبھی اشک بہائے — یہ حال ہوا چھپ گیا دریا تہ دریا
پوشیدہ مرے سینے میں یوں ہیں دُرِ مضموں — جس طرح صدف میں دُرِ یکتا تہ دریا
یورش فوج یاس سے ہو گیا ملک دل تباہ — تیغ الم سے گر پڑا کٹ کے نشان آرزو
باوفا - مجبور عاشق ہیں؟ کہ تو؟ — بے وفا سفاک قاتل تو؟ کہ ہیں؟
ابھر کر ان کا سینہ کہہ رہا ہے — یہ نخل حسن کے پھل ہیں رسیلے
تمہارے چشم میگوں کے اثر سے — لڑینگے خم سے خم ساغر سے ساغر

تصویر شاعری

یہ ماحصل الفت و عشق شعرا ہے — خاصے ہیں تنومند مگر حال برا ہے
تمغائے تفاخر ہوئی رسوائی عالم — اس عشق کی سرکار سے کیا رتبہ ملا ہے
مفروضہ ہیں اشکال تو الفت ہے کہاں کی — تصویر خیالی ہے تو پھر عشق ہی کیا ہے
معشوق بھی پھر وہ کہ محالات کا مجمع — ہر عضو میں ہر جنس کا اک جوڑ لگا ہے
فندق لب و پستہ دہن و سیب زنخداں — میوے کا ہے انبار کہ یار شعرا ہے
ابرو ہیں کماں تیر مژہ اور نگہ تیغ — وصف رخ جاناں ہے کہ سامان وغا ہے
غنچہ دہن و گلبدن و سرو سہی قد — دلبر کا سراپا ہے کہ اک باغ لگا ہے[1]

میر نوازش علی لمعہ

انھیں اس روز سے مشق ستم ہے — نہ تھی جب ابتدا لوح و قلم کی
ترے کوچے کو جب مسکن بنایا — زیارت کر چکے دیر و حرم کی
بھریں آہیں تو شعلے اور بھڑکے قلب سوزاں میں — بہے آنسو تو رونق پڑ گیا سرو چراغاں میں
نہ کیوں ہو خال سے حسن ملیح یار کی شورش — یہی تو کنکری اک رہ گئی ہے اس نمکداں میں
اڑے گا رنگ روئے گل بہ رنگ بوئے گل آخر — ہم اے لمعہ سبق عبرت کا پڑھتے ہیں گلستاں میں

---

[1] رسالہ صحیفہ و رسالہ افادہ

زنگی اور آئینہ

کسی زنگی نے اک آئینہ رستے میں پڑا پایا
نظر آئی جب اس میں شکل زشت اسکی تو گھبرایا

وہ چپٹی ناک وہ نتھنے کشادہ ہونٹ وہ موٹے
وہ چوڑے دانت جن پر ہو گماں غول بیاباں کا

ہوئیں یہ دیکھ کر غصے سے اسکی لال لال آنکھیں
تھا کالا کوئلہ پہلے بنا اب سرخ انگارا

لگا مار سیہ کی طرح کھانے پیچ و تاب اس دم
برائی اپنی صورت کی قصور آئینہ کا سمجھا

رہی بالکل نہ تاب ضبط جب اسکو تو جھنجھلا کر
زمیں پر آئینہ پٹکا چڑھا کر ناک یوں بولا

اسی سے تو کسی نے راستے میں اسکو پھینکا ہے
نظر آتی ہے اس میں کیا بڑی ہیبت برا چہرا

جو اپنے عیب سے غافل ہیں انکی ہے یہی حالت
خفا لمعہ ہوں اس سے بتائے عیب جو ان کا

رباعی

ہر کاخ کو ہم نے خاک ہوتے دیکھا
ہر صبح کا سینہ چاک ہوتے دیکھا

ہے لمعہ کو ورد کل شئی ھالک
جس کو دیکھا ہلاک ہوتے دیکھا

پختہ جو ہو ثمر تو خامی کے بعد
عزت ملی یوسف کو غلامی کے بعد

حاصل ہوا لمعہ خضر کو آب حیات
اک جرعہ ہزار تشنہ کامی کے بعد ۱

مرزا نظام شاہ لبیب

کچھ نہ کچھ دنیا میں آکر کام کرنا چاہیے
حیف ہے ان غافلوں کو ڈوب مرنا چاہیے

بتلائے آب و گل ہیں کیوں یہ ارباب چمن
آئے ہیں جس کام کو وہ کام کرنا چاہیے

ہے صبر و سکوں غائب دنیا کے حریصوں کا
غیرت انھیں کیا ہوگی جو بندے ہیں درہم کے

رو پیٹ کے گلشن سے ہر شب کوئی جاتا ہے
آنسو جو ٹپکتے ہیں ہر پھول سے شبنم کے

نہ چھیڑو ہمنشینو! بلبل شیدا کے افسانے
ہمیں اپنی پڑی ہے اور تمھیں دنیا کے افسانے

تباہی میں ہے کشتی قوم کی اے ہمدمو! دوڑو
سنانے ہیں تمھیں دل کھول کر دریا کے افسانے

مرا نوحہ مری قوم جگر افگار کا قصہ
بھلائے دیتا ہے ہنگامہ فردا کے افسانے

ہلاکت کس مپرسی اور بدخواہی خود بینیاں
غضب ہیں روح فرسا ملت بیضا کے افسانے

لبیب اس بزم کے ایسے پریشاں خاطروں میں ہیں
تمھیں بے چین کردینگے مرے تنہا کے افسانے ۲

علی شبیر شبیر

ندی چڑھاؤ پر ہے شراب طہور کی
مے نوش لا رہے ہیں خبر دور دور کی

لہ رسالہ صحیفہ سکہ رسالہ افادہ

کیا دیکھے کوئی روشنی اب شمع طور کی — بارش سی ہو رہی ہے مدینہ میں نور کی

چمکی ہلال گنبد خضرا کی چاندنی

پھیکی پڑے نہ کیوں ید بیضا کی چاندنی

نکلا ادھر تو چاند فلک پر بہ آب تاب — یاں چمکے جھاڑ ہانڈیاں فانوس در حباب

کیوں کر نہ ہو زمین مدینہ فلک جناب — اک اک چراغ کوکب و انجم کا ہے جواب

واں ہیں نجوم ماہ منور کے آس پاس

یاں قمقمے ہیں روضہ انور کے آس پاس

اب چاند لے رہا ہے ہلوے جھلک جھلک — کلسی دکھا رہی ہے جھکڑے وکٹ مک

روضے سے آ رہی ہیں ہوائیں مہک مہک — سبزہ مچل رہا ہے زمیں پر لہک لہک[۱]

محمد حیدر خاں لقمان الدولہ دلؔ

افسانہ گل قصہ بلبل نہ سنا اور — اٹکھیلیاں کچھ اپنی دکھا باد صبا اور

اے خضر رہ ہادی ہو مرے راہ لو اپنی — اس منزل عشاق کا ہے راہ نیا اور

سنبھل جاؤ کہیں اے حضرت دل راہ پر آؤ — یہ رسوائی سر ہر کوچہ و بازار کیسی ہے

دل سے وصل جاناں کی آرزو نہیں جاتی — خاک ہو گئے لیکن جستجو نہیں جاتی[۲]

فیاضؔ | محمد فیاض الدین خاں شاگرد حضرت فیض رہ ۱۳۲۵ھ میں انتقال ہوا فرماتے ہیں۔

ہماری داستاں پر کان وہ رکھتا نہیں شاید — کوئی در پردہ اس گل پیرہن کے کان بھرتا ہے

نکل آتا ہے جب مذکور ان کی سرد مہری کا — تو بیمار محبت ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے

زباں پکڑے کوئی کس طرح سے فیاض پر اسکی — ٹھکانے کی نہیں اک بات کہتا ہے مکرتا ہے[۳]

مائلؔ | ڈاکٹر احمد حسین مائل مشہور شاعر دیوان شایع ہو چکا ہے۔ شمالی ہند کے مشہور شعرا میر جرأت۔ سودا۔ انیس۔ امیر داغ وغیرہ کے جواب پر ان کی طویل غزلیں ہیں۔

گناہوں سے کیوں ہو پریشان مائل — خدا بخشدے گا خطائیں تمھاری

دل میں آ کر نقاب اٹھائی ہے — خود نمائی خدا نمائی ہے

نزاکت میں غضب کی ہاتھا پائی ہوتی جاتی ہے — کہ دم چڑھتا ہے پھر زور آزمائی ہوتی جاتی ہے

منصور کی آواز مرے لب پہ گر آئے — قطرہ میں دریا کا تماشا نظر آئے

---

[۱] ذوفا [۲] تذکرہ شعرائے دکن عبدالجبار خاں آصفی [۳] دیوان فیاض

گزالہ کروں وجد میں دیوار و در آئے ۔۔۔ سجدے کے لئے خاک پہ میرا ہی گھر آئے
مستانہ جوانی تری اے فتنہ گر آئے ۔۔۔ ہر بات میں ہو گھات نظر میں اثر آئے
کیا صبر ہو کیا چین ہو جب وہ نظر آئے ۔۔۔ دل تھام لیا جان چلی اشک بھر آئے
مزا دیتا ہے مائل کو ترا سینہ ترا چہرا ۔۔۔ یہ کچھ کا فر جوانی کا وہ کچھ بھولے لڑکپن کا
جو بھڑکے حسن کا شعلہ نہ گھبرانا نہ شرمانا ۔۔۔ خدا کے ہاتھ ہے جلنا نہ جلنا تیری چلمن کا
نہ ہو گی ایسی رونق حاجیوں سے کعبۃ اللہ میں ۔۔۔ نگاہوں سے عجب عالم ہو دروازے کے روزن کا
مائل خدا سے مانگنے کی خو نہیں گئی ۔۔۔ پیدا ہماری قبر سے دست دعا ہوا
محبت نے مائل کیا یہ کسی کو ۔۔۔ کسی پر کسی کو کسی پر کسی کو
وہ کافر ہوں رہوں محشر میں بھی کفر پہ قائم ۔۔۔ خدا کے سامنے سجدہ کروں تصویر جاناں کو[1]

رنج | میر محمد علی موسوی رنج نواب میر عالم کے خاندان سے تھے دیوان شائع ہو چکا ہے۔

مجھ سے کہتا ہے یہ دل دیکھ نکل جاوں گا ۔۔۔ کیا سنبھالے سے محبت میں سنبھل جاونگا
عیش کے لطف میسر مجھے اس دن ہوتے ۔۔۔ دونو پہلو میں مرے دو بت کمسن ہوتے
راحت و آرام دنیا میں کہاں ۔۔۔ قید خانہ ہے یہ مومن کے لئے
کوچہ یار کی ہے وہ عظمت ۔۔۔ بادشاہوں نے بھی گدائی کی[2]

اب میں بعض ان شعرا کا کلام پیش کروں گا جو اگرچہ زاد بوم کے لحاظ سے دکن کے نہیں کہے جا سکتے لیکن بہ لحاظ اس اصول کے جو میں نے مقدمہ میں قائم کیا ہے دکھنی کہلانے کے ضرور مستحق ہیں۔

جلیل | جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل جانشین حضرت امیر مرحوم کو ایک زمانہ جانتا ہے آپ کا کلام کسی تعریف یا تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ کی شاعری نے دکن میں اردو کی ترقی میں جو کام کیے ہیں ان کے مد نظر آپ کے ذکر خیر کے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

جب ترے عشق کا پھندا مری گردن میں رہا ۔۔۔ پھر برابر ہے قفس میں کہ نشیمن میں رہا
قیس و فرہاد کا بھرتے رہے بھروپ جلیل ۔۔۔ یہی سودا تھا یہی کھیل لڑکپن میں رہا
رات دل سے مرے اس درد کے نالے نکلے ۔۔۔ گھر سے اپنے وہ کلیجے کو سنبھالے نکلے

---

[1] دیوان مائل [2] دیوان رنج

فتویٰ دیا ہے مفتی ابر و بہار نے　　توبہ کا خون بادہ کشوں کو حلال ہے
آج سنتے ہیں وہ اپنا مدعا کہنے کو ہیں　　کون جانے دل میں کیا ہو منہ سے کیا کہنے کو ہیں
ان بتوں ہی نے کیا ساری خدائی کو تباہ　　برہمن کیا ہم اسے پیش خدا کہنے کو ہیں
ساری دنیا جانتی ہے جیسے حضرت ہیں جلیل　　جان دیتے ہیں بتوں پر پارسا کہنے کو ہیں
میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی　　کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانہ کا
صحبت پیر مغاں میں یہ کھلا راز جلیل　　خلد کہتے ہیں جسے نام ہے میخانے کا
آج سنتا ہوں کہ دشمن سے گلے مل آیا　　اب مرے کام کا تو خنجر براں نہ رہا
کس کا سر سامنے قاتل کے نہیں خم ہوتا　　جھک کے تلوار بھی آداب بجا لاتی ہے
موت بھی روٹھ کے بیٹھی ہے مسیحا کی طرح　　کس سے پوچھوں کہ علاج شب فرقت کیا ہے
جلوہ حسن ترا ہوش اڑا دیتا ہے　　یہی صورت ہے تو دیدار کی صورت کیا ہے
جو رات بھر تری محفل میں شمع جلتی ہے　　زبان حال سے کہتی ہے داستاں میری
شرم عصیاں سے تلافی ہوئی مے نوشی کی　　غرق ہونے پہ بھی دامن نہ ہوا تر اپنا[1]

نظم طباطبائی | نواب حیدر یار جنگ مولوی علی حیدر صاحب نظم طباطبائی سے کون واقف نہیں ہے اسی طرح آپ کا کلام بھی شہرہ آفاق ہے۔ روانی و برجستگی کلام سے جوش طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔ الفاظ کی تازگی سے کلام میں نگینے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے قصائد مشہور ہیں ان میں سے زیادہ تر سیرت النبی سے متعلق ہیں مثلاً بعثت و فتح مکہ۔ معراج ہجرت و غزوۂ بدر وغیرہ وغیرہ

ان قصاید میں بلاغت تشبیہ و استعارات کا استعمال جس خوبی سے کیا گیا ہے وہ نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ اردو میں میر انیس کے بعد کسی نے نہیں لکھا ہے۔ حقیقت میں وہ اعجاز ہے آپ کے کلام کے مختلف انتخابات پیش کئے جاتے ہیں۔

قصیدہ بعثت و فتح مکہ میں تلوار اور گھوڑے کے متعلق تشبیہ ملاحظہ ہو ۔

لکھوں ہر تیغ کی خوبی کہ ہر رہوار کی شوخی　　جو آفت اس نے برپا کی قیامت اس نے بھی ڈھائی
کرشمے اور اشارے ابرو معشوق کے اس میں　　دل عاشق کی اس میں بیقراری ناشکیبائی
چلی وہ ناز سے بنکر تو یہ انداز سے تن کر　　اڑایا اس نے سر کافر کا اس نے لاش ٹھکرائی
وہ بجلی کی طرح کوندی یہ شعلہ کی طرح بھڑکا　　دم پیکار اس نے خون اس نے خاک برسائی

---

[1] دیوان جلیل

بہایا اس نے جوں جوں خوں اسکے سم نے ہو رنگین
اڑائی اُس نے جوں جوں خاک ورایں نے جلا پائی

حرارہ جب لیا اُس نے یہ کوندے کی طرح لپکا
ترارہ جب بھرا اِس نے تو وہ بجلی سی لہرائی

جو اُس کی آنچ تھی آفت تو اسکی چال تھی آندھی
لگائی آگ اُس نے رزم گہ میں اِس نے بھڑکائی

پسینہ میں جو یہ تر ہے تو اُس پر دام جوہر ہے
گہر ریزی جو اُس میں ہے تو اس میں گوہر آرائی

ابر کی تشبیہات قصیدہ ذکر جاہلیت و جہاد آنحضرت میں ملاحظہ ہوں

اودی اودی یہ گھٹائیں ہیں کہ لیل الیل
بن گئی یا شب دیجور سمٹ کر بادل

ابر کہسار میں بال و پر شاہین کا ہے رنگ
کہ جھکا پڑتا ہے وہ سبزہ سمجھ کر ہر پل

یوں کسی ہونٹ پہ جمتی نہیں دیکھی مسی
یوں کسی آنکھ میں کھلتے نہیں دیکھا کاجل

کردیا مشک تتاری نے ہوا کو تاریک
بھر دئے ابر بہاری نے برس کر جل تھل

ہے ابر یا دیو سیہ سرشار و مست و خشمگیں
خنداں رخ و گریاں مژہ روشن دل و تیرہ جبیں

....

آتا ہے وہ قطرہ لئے پانی سمندر سے پئے
گزرا جدھر بکھرا دئے گلہائے در دامن میں

گریہ کناں گوہر فشاں قطرہ زناں دامن کشاں
مانند زلف مہوشاں تاریک و تار و عنبریں

دل میں طرب لب پر فغاں سر بر کف و کف بر دہاں
انداز میں پیل دماں آواز میں شیر عریں

....

باطن میں ہے فیض اتم ظاہر میں ہے طرز ستم
دل میں چھپا ذوق کرم تیور سے پیدا خشم و کیں

اٹھتا ہوا سر سے دھواں آب اور آتش درمیاں
کھینچے ہوئے رنگیں کماں جادو گر صندل نشیں

ناسیوں کی طرح سے روئے ہوا اڑتا پھرے
کہف و جبل میں یوں جیسے گزرے ہیں ایام و سنیں

قصیدہ ہجرت اور غزوۂ بدر میں طلوع صبح ملاحظہ ہو

ہے شفق یا وادی فیروزہ گوں میں لالہ زار
ہے سحر یا سبزہ زار آسماں میں آبشار

چاہ سے نکلے ہیں یوسف یا ہے تار صبح کا
یا تبا گوش زلیخا میں ہے در شاہوار

آفتاب آیا نظر سر در گریبان افق
ہو گئی غائب شب یلدا ہوئی صبح آشکار

آتش افروزی جو کی مشرق میں پیر صبح نے
ہو گیا مغرب میں پنہاں ساحر زنار دار

آسمان شعبدہ گر نے یہ کی افسوں گری
مہرہ مشرق میں آ نکل کر چھپ رہا مغرب میں مار

قصیدہ غزوہ حنین میں بہار کا سماں قابل ملاحظہ ہے

کیا اعتدال آج ہے باد بہار میں
کافور صبح ہے ہر نقش مشکبار میں

شیریں زیادہ چشمۂ زمزم کے آب سے
مرغ سحر کا زمزمہ ہے مرغزار میں

کچھ دلفریب قلقل مینا سے بھی سوا
کبک دری کا قہقہہ ہے کوہسار میں

مدہوش کر رہے نہالان کنج باغ
عنبر کا لخلخہ ہے نسیم بہار میں

نغموں سے ارغنوں کے بھی بڑھکر شمیم سنج
آہنگ دلنواز ہے صورت ہزار میں

کرتا ہے رقص سرو گلستان کنار جو
ڈوبا ہوا ہے شور طرب آبشار میں

اب بعض قصیدوں سے کچھ نمونہ پیش کرتا ہوں جو واقعہ نگاری روزمرہ وغیرہ کے لحاظ سے قابل داد ہیں؎

تھا پیمبر کے تعاقب میں سراقہ اک شریر
بت پرست و چیرہ دست و فاقہ مست و بادہ خوار

دور سے دیکھا جو ناقہ کو رسول اللہ کے
دی صدا کافر نے آپہنچا میں او ناقہ سوار

صبح ہوتے ہاتھ آیا میرے دامان مراد
رات بھر ہیں چھان مارے میں نے دشت و کوہسار

شرط بد کر غول صحرا سے پھرا ہوں رات بھر
آج لینا ہے ابوسفیاں سے اونٹوں کی قطار

کھلا دروازۂ حصن قموص اک پہلوان نکلا
شریر و پر دل و خیرہ کش و سفاک و غارتگر

سراپا غرق تھا آہن میں پہچانا نہ جاتا تھا
کہ پہنے تھا جھلم چار آئینہ جوشن زرہ بکتر

. . . .

مقابل فاتح خیبر کے جوش غیظ میں آیا
پڑھا چیں بر جبیں کف در دہاں کھینچے ہوئے خنجر

پکارا نام مرحب ہے مرا مشہور عالم میں
مقابل میرے ہو وہ جس کو اپنی جان ہو دوبھر

اماں کا ہو اگر خواہاں تو لا تیغ و سپر رکھ دے
جگرداری کا ہو دعویٰ تو لے شمشیر و پیکر

ملا کر آنکھ اس کافر سے حضرت نے یہ فرمایا
کہ میری والدہ نے نام رکھا ہے مرا حیدر

یہ سنتے ہی دگرگوں ہو گیا احوال ظالم کا
اڑا چہرے سے رنگ اس کینہ جو کے بجھ گئے تیور

اب تو زمین سر لئے لگی رزمگاہ کی
دشمن کے پاؤں جم نہ سکے کارزار میں

سوئے جحیم ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلے
بت ہر قدم پہ ملتے ہیں راہ فرار میں

ٹھیریں اگر تو جنگ میں چلتے نہیں ہیں ہاتھ
بھاگیں اگر تو پاؤں نہیں اختیار میں

تاب ستیز اب ہے نہ پائے گریز ہے
چارہ سوائے قتل نہیں اضطرار میں

دو دو سوار چھد گئے اک اک سنان میں
دو دو پیادے کٹ گئے ایک ایک وار میں

میدان سے گریز نشانی اجل کی تھی ۔ بھاگے ہوئے بچے ہیں کہیں روزگار میں

قصیدہ مدح خسروی بہ تتبع ذوق دہلوی مرحوم

عطارد تیرے اورنگ حکومت کا ثناگر ہو ۔ کمر خنجر کا تیرے شعلۂ مریخ جوہر ہو
ضیا میں بڑھ کے زہرہ سے ترے طالع کا اختر ہو ۔ قمر فنجان شیرا ور مہر تاباں مے کا ساغر ہو
یہ تیرا دور دور مشتری ہو بلکہ بہتر ہو
ترے زیر نگیں مانند کیواں ہفت کشور ہو

ترا ہر حکم محکم بڑھ کے ہو سد سکندر سے ۔ جہاں کے خشک و تر پہ تیرا باران کرم برسے
ترے انصاف و عدل و رافت مظلوم پرور سے ۔ فلک کانپے زمیں لرزے جفا سہمے ستم ترسے
دہائی تیری ہو عالم میں اور تو دادگستر ہو
سدا اڑتا نہ بچے بال ہما کا چتر سر پہ ہو

تجھے اے آصف سابع ملے اوج سلیمانی ۔ دکن کو تیرے دم سے ہو سدا دعوی کنعانی
رہے مہارانیوں میں شان فغفوری و خاقانی ۔ در دولت پہ تیرے فخر ہو دارا کو دربانی
یہ چوکھٹ سجدہ گاہ تغلق و محمود و سنجر ہو
یہ گھر وہ ہو جہاں آئینہ داروں میں سکندر ہو

ایک مثنوی کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ابر پانی کہاں سے لاتا ہے ۔ کیا سمندر سے پی کے آتا ہے
برق و باراں میں لاگ کیسی ہے ۔ اور یہ پانی میں آگ کیسی ہے
مہر و ماہ کا گہن یہ کیسا ہے ۔ آسماں پر چمن یہ کیسا ہے
گھٹتی بڑھتی ہے کیوں لیل و نہار ۔ چرخ چارم ہے یا زمیں دوّار
جب سمجھ ہی میں کچھ نہیں آتا ۔ دم تمہارا نہیں ہے گھبراتا
تم پہ واجب ہے کسب علم و فنون
نہ کہ یہ مستی و شراب و جنون [1]

انگریزی نظموں کے ترجمے بھی مولانا کی ایک خاص چیز ہیں۔
یوں تو انگریزی نظموں کے اکثر و بیشتر ترجمے ہوئے ہیں مگر مولانا علی حیدر صاحب

---

[1] نظم طباطبائی

حیدر یار جنگ طبا طبائی نے جو کمال اپنے ترجموں میں دکھلایا ہے واقعی یہ کہ وہ مولانا ہی کا حصہ ہے
مولانا نے جس خوبی و عمدگی سے اکثر مشہور و معروف اعلیٰ درجہ کی نظموں کو بہترین
اردو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے اس کے استادان فن معترف و مداح ہیں۔

چند نظموں کے انتخاب ملاحظہ ہوں :۔

"گرے" انگلستان کا ایک نامور شاعر گزرا ہے جس کی شاعری کا مایۂ ناز اس کی مشہور و معروف "الیجی" یعنی "مرثیہ" ہے۔ "الیجی" کا اردو ترجمہ انتہائی خوبی و کمال کے ساتھ مولانا نے "گور غریباں" کے نام سے کیا ہے۔

وداع روز روشن ہے گجر شام غریباں کا — چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا — یہ ویرانہ ہے میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

اندھیرا چھا گیا دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے — جدھر دیکھوں اٹھا کر آنکھ ادھر اک ہو کا ہے عالم
مگس لیکن کسی جا بھر رہی بے وقت گاتی ہے — جرس کی دور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

کبھی اک گنبد کہنہ پہ بوم خانماں ویراں — فلک کو دیکھ کر شکووں کا دفتر باز کرتا ہے
کہ دنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہوں پنہاں — کوئی پھر کیوں قدم اس کنج تنہائی میں دھرتا ہے

قطار اک سامنے ہے مولسریوں کے درختوں کی — وہاں قبریں ہیں کچھ مٹی کے جیسے ڈھیر ہوتے ہیں
ہر اک نے مر کے بس دو گز کفن گز بھر زمیں پائی — بسانے والے جو اس گاؤں کے تھے سب وہ سوتے ہیں

نظر آتے نہیں کتبے مزاروں پر تو کیا غم ہے — چراغان اور صندل اور گل و ریحاں نہ ہو تو کیا
نہیں بگیرہ اور کمخواب کی چادر تو کیا غم ہے — جو خوش آہنگ کوئی قاری قرآں نہ ہو تو کیا

بناتے ہو بہو تصویر اگر مدفن پہ رکھنے کو — پلٹ کر اس سے کچھ نکلی ہوئی سانس آ نہیں سکتی
دعا ہو فاتحہ ہو مرثیہ ہو آہ و زاری ہو — کوئی آواز ان کے کان ہی تک جا نہیں سکتی

الگ ہر نیک و بد سے دور دنیا کے مکائد سے — گئے بیگانہ وار اور خلق میں بیگانہ وار آئے
رہے محفوظ ابنائے زمانہ کے مفاسد سے — قدم راہ توکل سے کبھی ڈگنے نہیں پائے

کبھی ایسی ہنسی لب پر کہ ظاہر جس سے کچھ نفرت" — "اور اس کے ساتھ ہی کچھ زیر لب کہتے ہوئے جانا
"کبھی تیوری چڑھائے منہ بنائے رنج کی صورت" — کہ جیسے دل پہ صدمہ ہے زباں جس سے ہے بیگانا

"خدا بخشے اسے بس دوست کا رہتا تھا وہ جویا — تو نکلا دوست اک آخر خداوند کریم اس کا"
"اب اس کے نیک و بد کا ذکر کرنا ہی نہیں اچھا" — "کہ روشن ہے خدا پر حالم امید و بیم اس کا"

زمزمہ فصل بہار (مضمون ٹامس گرے)

جدھر سے قافلہ گزرا ہوا اندر کی سواری کا — وہ نسریں پوش لشکر انجم صبح بہاری کا
سبب تھا لالہ و ریحاں کی جو امید واری کا — جگایا جس نے جادو فصل گل کی لالہ کاری کا
جہاں بلبل کلیجہ توڑ کر فریاد کرتے ہوں — جو قمری کوکتی ہو رقص سب شمشاد کرتے ہوں
وہیں مجھ کو بھی مل جائے کوئی گوشہ جو عزلت کا — کوئی پتھر ہو تکیہ اور سبزہ فرش راحت کا
کنارہ نہر کا ہو وقت ہو جوش طبیعت کا — سبق اہل جہاں کے حال پر حاصل ہو عبرت کا
کہ ادنیٰ تو چڑھے جاتے ہیں اب عرش معلیٰ پر — جو ہیں اعلیٰ جھکے پڑتے ہیں وہ تحصیل دنیا پر
ذرا سننا انھیں میں سے کوئی ہنسکر یہ کہتا ہے — خبر اپنی تو لے ناصح کہ تو بھی اک پتنگا ہے
اکیلا آیا تو دنیا میں اور اب تک اکیلا ہے — نہ ہو جب شمع محفل میں تو کاشانہ اندھیرا ہے
کہیں ڈھونڈھے نہ اب پائیگا طاوس جوانی کو — لب بام اب سمجھ لے آفتاب زندگانی کو

لانگ فیلو کی نظم کا ترجمہ

خوشیاں دنیا کی اور دنیا کے ملال — مقصود ہمیں وہ نہ یہ مطلوب ہیں
ہاں چاہیے وہ روش کہ ہو جائیں نہال — دن آج کا گزرے کل سے بھی خوب ہیں
کرتے ہیں بہت سے سانگ ورات ہی کم — اور دیکھتے ہیں جب اپنے ہم دل کی طرف
نقارہ ہے اک کہ بج رہا ہے پیہم — یعنے ہے سفر گور کی منزل کی طرف
شاید کوئی عزیز گم کردہ سبیل — سرگشتہ و پاشکستہ وادی دہر
دیکھے جو ہمارے نقش پا مثل دلیل — ہمت کرے منزل کی پھر آئے اسے لہر
آنکھیں کھولو اٹھو کمر کو باندھو — اب پائے طلب کے نہ اب دست سوال
انجام اس سعی کا جو ہونا ہو سو ہو — کاسب کو کمال چاہیئے استقلال[ئہ]

اختر ۔ نواب اختر یار جنگ مولوی لطیف احمد مینائی

دل کے ارمان رہے گو نہ رہا دل باقی — بجھ گئی شمع مگر ہے ابھی محفل باقی
جور و ستم پہ آپ کے قربان جائیے — کیا کیا ابھی ہے ہونے کو کیا کیا ابھی ہے
مکتب میں بے حجابی لیلیٰ تو دیکھئے — واقف نہیں کہ قیس کو سودا ابھی ہے
قاتل تری اس شوخی رفتار کے صدقے — بجلی سے تڑپ جاتی ہے تلوار کمر میں
کوتاہی شب وصل میں قدرت تھی خدا کی — دیکھا تو کوئی فرق نہ تھا شام و سحر میں

ئہ و ئلہ ۔ از نظم طباطبائی

قایل ہوں میں اس حسن خدا داد کا اختر — جو دل میں سما جائے جو کھپ جائے نظر میں
گل فشانی ہم کریں بلبل تو ہو طرفہ بہار — آشیاں گلشن میں گلشن آشیانے میں رہے[1]

ضامن سید محمد ضامن صاحب ضامن عرصہ دراز سے آپ کا خاندان حیدرآباد میں متوطن ہے آپ کی شاعری کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کا دیوان شایع ہو چکا ہے۔ رسالہ لسان الملک آپ ہی کی اڈیٹری میں شایع ہو رہا ہے۔

پیمانہ ہے رندوں کا پیمان ارادت ہے — ہر موج شراب ان کو محراب عبادت ہے
ہے مستحق رحمت زحمت کش محرومی — زحمت جسے سمجھے ہو دیباچۂ رحمت ہے

دل میں طوفان تمنا نظر آتا ہے مجھے — قطرہ جو لا نگہ دریا نظر آتا ہے مجھے

رہ کے دنیا میں بہر حال بسر کرنا تھا — تھا ہلاک غم ہستی جو نہ شاداں ہوتا
حرف مطلب وہ جسے محو کیا ہے تو نے — کاش میرے خط تقدیر کا عنواں ہوتا
موج مے برق ہے اور برق ہے ساماں حیات — زندگی یہ تھی کہ پیمانے سے پیماں ہوتا
دل میں ہوتے نہ اگر خار و خس بیم و رجا — رشک فردوس تمنا کا بیاباں ہوتا
کیا کریں کس سے کریں شکوۂ قسمت ضامن — ہوتے کیوں قیدی زنداں اگر امکاں ہوتا

لارڈ ٹینی سن ملک الشعرائے انگلستان کی مشہور مثنوی "اینک آرڈن" کا نہایت عمدہ ترجمہ "شہید وفا" آپ فرما رہے ہیں اس کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو:-

دھارس کی یہ گفتگو ہوا کی — چپکی وہ غریب دکھ سنا کی
دل کو ہر طرح سے سنبھالا — امید پر غم کو اس نے ٹالا
لیکن جب اور ذکر آیا — پانا کچھ گفتگو نے کھایا
اینک کرنے لگا نصیحت — جیسی ہے سپاہیوں کی عادت
اللہ کا آسرا بتایا — تسلیم و رضا کا ذکر لایا
خاموش رہی کہا نہیں کچھ — کچھ اس نے سنا سنا نہیں کچھ
جیسے کوئی گاؤں کی اکیلی — بیٹھی ہوئی نہر پر اکیلی
رکھ کر خالی گھڑا تہ آب — خود بحر خیال میں ہو غرقاب
ہو پیش نظر وہ یار جانی — بھر کے اسے دیتا تھا جو پانی
جتنی کہ گھڑا بھرے چھلک جائے — لیکن یہ سنے بھی اور نہ سن پائے[2]

---

[1] رسالہ ذخیرہ [2] رسالہ لسان الملک۔

دورِ ثالث کی نثر کا نمونہ

عموماً ہر زبان میں نثر سے پہلے نظم کی ابتدا ہوی ہے اسی لئے ابتدائی کتابیں نظم ہی میں قلم بند ہوتی تھیں مگر جیسے جیسے زبان ترقی یافتہ ہوتی جاتی ہو ویسے ویسے علم و فن کی کتابیں بجائے نظم کے نثر کے قالب میں ڈھلنے لگتی ہیں۔ اور حقیقت میں فنون کے لئے نظم کا جامہ موزوں نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ہر طرح نثر ہی زیادہ مفید ہے۔

دورِ ثانی میں بیان ہوچکا ہے کہ اس عہد میں بھی فنون کی کتابیں نثر میں مرتب و مدون ہونی شروع ہوگئیں تھیں مگر اس دور میں اس کی ترقی کے گئے زینے طے ہوئے اور ہر ایک فن تاریخ فلسفہ منطق۔ تصوف۔ حدیث۔ فقہ۔ کیمیا۔ طبعیات۔ ہیئت۔ طب۔ فلاحت وغیرہ کی کتابیں تصنیف و تالیف ہونے لگیں۔

اس امر کا دعوی کیا جاسکتا ہو کہ جس طرح نظم کی ابتدار کا سہرا دکن کے سر ہے اور اس کی ترقی میں بھی دکن کا کافی حصہ رہا ہے۔ اسی طرح نثر کی ابتدا بھی یہیں سے ہوی اور اس کی ترقی میں بھی دکن کا خاصہ حصہ رہا ہو۔ گزشتہ اور آیندہ صفحات اس دعوی کی دلیل ہیں۔

نظم کے نمونوں میں میں نے اُن اصحاب کے کلام کا انتخاب بھی پیش کیا ہے جو بہ لحاظ تولد دکنی نہیں تھے بلکہ بہ لحاظ توطن ان کو دکنی کہا جاسکتا تھا مگر نثر میں صرف اُن ہی اصحاب کے زورِ قلم کو پیش کروں گا جو ہر حیثیت سے دکنی کہلانے کے مستحق اور سزاوار ہیں۔

کیونکہ اگر ان اصحاب کے نمونوں کو پیش کیا جائے تو مضمون نہایت طویل ہو جائے گا اس دور میں ہندوستان کے تقریباً تمام مشہور اور مسلم الثبوت نثار اور انشاپرداز حیدرآباد میں جمع تھے اور اُن کے علمی و ادبی کمالات کا اظہار اکثر و بیشتر حیدرآباد ہی میں یا حیدرآباد کی قدردانی سے ہوتا رہا۔

"تہذیب الاخلاق" کے مشہور مضمون نگار نواب محسن الملک مولوی سید مھدی علی نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی اور مولانا نذیر احمد حیدرآباد ہی کے وابستہ تھے اور مدتوں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں یہ مایہ ناز بزرگ حیدرآباد میں اقامت گزین رہے۔

شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی نے "تمدن عرب" اور "تمدن ہند" کا یہیں ترجمہ کیا۔

نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی اسی سرزمین میں عمر بسر کر رہے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی ایک زمانہ تک حیدرآباد میں ناظم علوم و فنون رہے ان کی اکثر کتابیں مثلاً الغزالی ۔ الکلام ۔ علم الکلام ۔ موازنہ انیس و دبیر وغیرہ یہیں عالم وجود میں آئیں ۔ ان کی تقریباً تمام تصنیفات و تالیفات دولت آصفیہ کی علم پروری اور معارف نوازی کی مرہون منت اور ان کا بڑا حصہ سلسلہ آصفیہ میں داخل ہے ۔

مولوی عبدالحلیم شرر کئی دفعہ یہاں کی سلک ملازمت میں منسلک ہوئے ۔

مولوی ظفر علی خاں نے خیابان فارس اور معرکہ مذہب و سائنس وغیرہ کا یہیں ترجمہ کیا ۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولوی عزیز مرزا نے سالہائے دراز یہاں زندگی بسر کی ۔

غرض ہندوستان کے ان مشہور و معروف مصنفین اور ممتاز انشا پردازوں کی زندگی اس طرح دکن میں بسر ہوئی کیا اُن کے علمی اور ادبی کارناموں کا جنوبی ہند کی اردو کے ساتھ کوئی تعلق قائم نہیں کیا جا سکتا ؟

المختصر اب میں خاص دکن کے چند انشا پردازوں کی تحریر کے نمونے پیش کرتا ہوں ۔

سب سے پہلے یمین السلطنتہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی نثر کا نمونہ پیش کروں گا اب تک آپ نے کئی تصنیفات مختلف فنون میں فرمائی ہیں اور بکثرت آپ کے مضامین اکثر رسالوں میں شایع ہوا کرتے ہیں ۔

"زمانہ اپنی نیرنگی اور تلون مزاجی سے آئے دن کی تبدیلیوں کا اکھاڑا ہے اس کی دلفریب نیرنگیاں کل یوم ھو فی شان کی پوری مصداق ہوتی جاتی ہیں یہی تبدیلیاں اور نیرنگیاں دانشمند اور فیلسوفوں کی چشم دوربین کے منظر ہو کر زمانے کے تغیرات کا ثبوت عین الیقین کی حد تک پہونچاتی ہیں اور اسی درسگاہ عالم سے العالم متغیر کا سبق حاصل کرتے ہیں اور اس پتھر کی طرح جو پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکایا جاتا ہے ہزاروں پلٹے کھاتا چلا جاتا ہے جو روپ بھرتا ہے اس کے چہرے پر کھل جاتا ہے اس کی قلابازیوں کی چپیٹ میں جو آتا ہے وہ اس کا ہو رہتا ہے البتہ اہل بصیرت اس کی تبدیلیوں کو ہر چہ دانی بدانکہ مظہر اوست کی صورت میں دیکھ کر معرفت آلٰہی کا سبق لیتے جاتے ہیں جب وہ دن کا بانا بدلتا ہے تو رات کے سارے علم و عمل باطل کر دیتا ہے اور تمام عالم پر نور کا کافور بکھیر دیتا ہے سوتوں کو نیند سے جگا دیتا ہے نکموں کو کام پر لگا دیتا ہے طبیعتوں سے سستی کو دور کر دیتا ہے ۔ موجودات عالم کی ہر چیز کو آفتاب کی روشنی

میں ہمارے نظر کے سامنے کر دیتا ہے۔ تاکہ اس کی دلچسپیوں سے لطف اٹھانے کا موقع ملے جو لوگ اپنے دین کے پکے اور روشن دماغ ہوتے ہیں اور بصیرت کے چراغ نے جن کے دلوں سے تاریکی دور کر دی ہے وہ لوگ اللہ نور السموات والارض کے عملی ثبوت دینے میں مصروف ہو جاتے ہیں جبل النہار معاشا کی جستجو میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں[1]۔"

مُلّا عبد القیوم مرحوم حیدر آباد کے مشاہیر سے تھے آپ کو نہ صرف تعلیمی امور سے دلچسپی تھی بلکہ ہر قسم کے قومی کاموں میں نہایت مستعدی سے حصہ لیتے تھے آج سے تیس سال قبل جبکہ کانگرس کی شرکت سے مسلمان کوسوں دور رہا کرتے تھے آپ اس کے جلسوں میں تحریکات پیش کرتے نظر آتے تھے۔ بہر حال ملا عبد القیوم صاحب سے تمام ہند واقف ہے۔ آپ کے نثر کا نمونہ بھی پیش کیا جاتا ہے :۔

"علم سیاست مدن میں یہ امر مسلم و تصفیہ شدہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں محتاج معاش ہے اور وجوہ معاش انسانی بعض طبعی ہیں اور بعض غیر طبعی۔ ذرایع معاش فلاحت صناعت تجارت ہیں اور غیر طبعی ذریعہ خدمت ہے۔ اس لئے پانچہزار سال سے یہ مثل زبان زد خاص و عام ہے "اوتم کھیتی مدھم بیپار" چاکری کشت بھیک ندان"۔ اوتم کھیتی اس واسطے ہے کہ انسان اپنی پہلے یا دوسرے درجہ کی ترقی سے جو کھودن اور جنگلوں سے نکل کر تمدنی حالت کی طرف ترقی کرتا ہے تو زراعت پیشہ بنتا ہے اور یہ پیشہ انسان کا فطری و بسیط اور سب سے مقدم پیشہ ہے اس لئے اسکو ابو البشر آدم کی طرف منسوب کرتے ہیں اور انہی کا ایجاد کردہ اور تعلیم دادہ سمجھتے ہیں اکثر صحرانشینوں اور بادیہ گزینوں کا یہی پیشہ ہے۔

صنائع اور حرفت چونکہ مرکبہ اور نظری و فکری ہیں اس سے متاخر اور دوسرے درجہ پر ہیں چونکہ ان میں سے اکثر علمی ہیں جو محتاج نظر و فکر و ممارست ہیں اس لئے اہل حضارت میں ان کا وجود پایا جاتا ہے نہ کہ اہل بداوت میں۔ جب بداوت سے حضارت کے مرتبہ پر انسان ترقی کرتا ہے تو محتاج صنایع و حرفت ہوتا ہے لہذا اس کو انسان کی ترقی کے دوسرے درجہ میں شمار کیا جاتا ہے[2]۔"

---

[1] رسالہ ذخیرہ۔ [2] رسالہ صحیفہ۔

مرزا مہدی خاں کوکب ان اصحاب میں سے ہیں جو سب سے پہلے بغرض تعلیم انگلستان گئے آپ کے علوم و فنون سے متعلق مضامین اور تراجم علمی رسائل میں اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہتے ہیں بعض مستقل کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کی تحریر کا نمونہ حسب ذیل ہی جو "فزیالوجی" کے متعلق ہے :-

"ہر چند یہ بہت دلچسپ بات ہی کہ ہم حیوانات نباتات اور احجار (پتھروں) کے ناموں اور ان کی حقیقتوں سے واقف ہوں اور یہ کہ وہ کہاں اور کیونکر پیدا ہوتے ہیں کن امور میں وہ ایک دوسرے سے مشابہت یا مباینت رکھتے ہیں کس طرح پر وہ ہمارے لئے مفید و کار آمد یا مضر ہو سکتے ہیں اور پچھلی صورت میں ہم اپنے آپ کو ان کے ضرر سے کس طرح سے بچا سکتے ہیں اور یہ بھی نہایت دلچسپ امر ہے کہ اجسام بسبب قوۃ جاذبہ کے زمین پر کس طرح گرتے ہیں۔ اور روشنی کس طرح منعکس ہوتی ہی اور برق کو کیونکر پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن جو چیز ان سب سے زیادہ اہم اور زیادہ دلچسپ ہے وہ یہ ہے کہ ہم خود کیونکر زندہ رہتے ہیں اور یہ کہ ہم اتنی عجیب و غریب چیزوں کے مشاہدہ کرنے اور بنانے پر کیونکر قادر ہوتے ہیں اور اس بات کا علم حاصل کرنا لازمی ہے کہ ان جانوروں کی تاریخ کیا ہے جو ہمارے اطراف میں ہیں جن کی زندگی ہماری زندگی سے بہت کچھ مشابہ ہی اور اپنے آپ کو پہچانیں کہ من عرف نفسه فقد عرف ربه صاف بتلا رہا ہے کہ ہم اپنے خدا کو نہیں پہچان سکتے۔ جب تک کہ ہم اپنے آپ کو نہ پہچانیں۔ پس فزیالوجی وہ علم ہی جس میں بظاہر حیات سے بحث ہوتی ہے یعنے علم افعال ابدان سے اور یہ لفظ دو یونانی لفظوں سے مرکب ہی فزیس بمعنی فطرت، یا طبیعت اور گولوس بمعنی علم یہ قول مشہور ہے العلم علمان علم الابدان وعلم الادیان۔ اس میں علم ابدان کو مقدم جانا ہی جس سے اس علم کی شرافت ظاہر ہے"

"سانس اندر لینے کے اثنا میں ہم کو محسوس ہوتا ہی کہ ہماری پسلیاں ابھر آتی ہیں اور سینہ چوڑا ہوتا ہی اور پیٹ پھولتا ہے۔ جیسے ہی ہوا ناک یا منھ میں سے داخل ہو کر شش میں پہنچتی ہے اور تنفس خارجی میں یعنی سانس چھوڑنے میں

اس کا عکس واقع ہوتا ہے پسلیاں دبکر اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہیں پیٹ چپٹا ہوجاتا ہے اور جوف سینہ کی گنجائش گھٹ جاتی ہے اور سینہ میں سے ہوا اسطرح خارج ہوتی ہے جیسے بھتے سے۔

اگرچہ بھتے کے ساتھ شباہت ہے لیکن وہ قوت جو کہ ہوا کو شش میں داخل کرتی ہے اور نکالتی ہے بالکل مختلف ہے[1]"

شمس العلماء نواب عزیز جنگ مرحوم نے اردو کی بہت خدمت کی۔ کثیر التعداد کتابوں کے مصنف اور مولف تھے ایک ضخیم فارسی لغت آپ کی زیر تالیف تھا جس کی کئی جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔ آپ کی ایک تالیف "تاریخ النوائط" ہے جس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"مولوی قادر عظیم خاں اپنی تصنیف گلستان نسب میں فرماتے ہیں کہ نائط گفتن اینہا رابسبب نسبت فرزندی از وائط نبیرہ جعفر طیار رضی اللہ عنہ است بہ سبب کثرت استعمال واؤ مبدل بنون شدہ۔ محمد قاسم ابن محمد ہاشم تذکرہ مشائخ الاصفیا نے بھی انھیں الفاظ کے ساتھ قوم نایط کی وجہ تسمیہ کا بیان فرمایا ہے۔ اتحاد لفظی سے پایا جاتا ہے کہ صاحب گلستان نسب نے اسی تذکرہ سے اپنی کتاب میں عبارت نقل کی ہے۔ مصنف گلستان نسب نے آگے چل کر کتاب کشف الانساب سے استدلال فرمایا ہے جو فاضل متبحر علامہ شیخ جلال الدین سیوطی محدث شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے جس میں شیخ نے اس قوم کو بنوالوائط لکھا ہے اور عبداللہ الوائط کی اولاد قرار دیا ہے۔ صاحب کشف الانساب ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ اس قوم کا مقام مدینہ مطہرہ سے ہجرت واقع ہونے کے بعد موضع وایط میں رہا ہے جو بغداد سے تین دن کی راہ تھی۔ مولف کتاب کہتا ہے کہ اس موضع کا نام بھی قوم کی وجہ تسمیہ میں کچھ دخل رکھتا ہو۔

علامہ شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی تصنیف لب اللباب فی تحریر الانساب میں فرماتے ہیں کہ نایت ایک ناحیہ کا نام ہے جو بصرہ میں واقع ہے مصنف تاج العروس فی شرح القاموس نے بھی اسی کو کسی قدر صراحت کے ساتھ لکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں نایت ایک موضع ہے بصرہ کا اور اسی سے منسوب ہیں ابوالحسن علی ابن عبدالعزیز

---

[1] رسالہ افادہ

ناشئی مشہور ادیب ہیں اور وہ حدیث بیان کرنے والے فاروق بن عبدالکریم خطابی ہیں جن سے
اور عبدالعزیز سے حدیث روایت کرنے والے "ابوطاہر اسنانی"[۱]

اس دور کے ایک مشہور انشا پرداز مولوی سید خورشید علی صاحب ہیں جن کے اکثر و بیشتر
مضامین ہندوستان اور دکن کے مشہور رسالوں میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ آپ کے مضامین کا
زیادہ تر حصہ "سیرۃ النبیؐ" اور "خواتین" سے متعلق رہا ہے۔

"بنی نوع انسان اسلام کی تمدنی اصلاحوں کے جس قدر زیر بار احسان ہیں محتاج بیان
نہیں غیر اقوام اور غیر مذاہب تک کو اس بات کا اقرار ہے کہ تمدن کو ترقی و تکمیل کے
انتہائی مدارج پر پہنچانے والے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی ہیں۔ اسری
ایرانی۔ مصری۔ یونانی۔ اور رومی تمدن اپنے اپنے وقت میں اس زمانہ کی حالت کے
مطابق اپنی نظیر آپ تھے مگر اب وہ سب گرد روزگار ہیں صرف ان کا نام ہی نام
رہ گیا ہے لیکن جو عظیم الشان تمدن پیغمبر عرب نے قایم کیا وہ آج تیرہ سو برس بعد
بھی اسی طرح کامل اور عدیم المثال ہے کہ اس کے سامنے نہ صرف نینوی بابل ایتھنز
صدور ممفس۔ تھیبیں وغیرہ کے گزشتہ تمدن ہی ہیچ ہیں بلکہ موجودہ زمانہ کے
دوسرے تمام شایستہ اور ترقی یافتہ اقوام و ممالک بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔"

"تاریخ شاہد ہے کہ ازمنہ ماضیہ میں عورتیں انسانوں اور حیوانوں کے درمیان
ایک قسم کی مخلوق سمجھی جاتی تھیں، لونڈیوں سے بھی بدتر حیثیت رکھتی تھیں ان پر
مردوں کی جابرانہ حکومت قائم تھی اور ان کا مصرف محض ترقی نسل، اور مردوں کی
ذلیل غلامی تھا۔ ہندو یونانی اور رومی قانون نے عورتوں کو ان کی مستقل شخصیت سے
ہمیشہ محروم رکھا۔ یونانی جن کی ترقی و تہذیب کا ایک زمانہ ثناخواں ہے عورتوں
کو ایک کم درجہ کی ذلیل مخلوق اور مردوں کی خدمت گزار سمجھتے تھے۔ محض ایک بچہ
پیدا کرنے کی کل سے زیادہ ان کی وقعت نہ تھی ان کی بے قدری و ذلت کی
انتہا یہ تھی کہ اگر کسی عورت کے ہاں ناقص الاعضا بچہ پیدا ہوتا تو اس عورت
کو مار ڈالتے تھے"[۲]

مولوی محمد مرتضیٰ صاحب "معارف علی گڑھ" اور صحیفہ ماہواری کے مشہور انشا پرداز
اور مضمون نگار ہیں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی معتمدی نے آپ کو تمام ملک سے روشناس

---

[۱] تاریخ النوائط [۲] رسالہ ذخیرہ

کر دیا ہے۔ علامہ شبلی کو بھی آپ کی علمی قابلیت اور مضمون نگاری کا اعتراف تھا۔ آپ کی ایک تاریخ "حیات تمدن" کا اقتباس حسب ذیل ہے۔ جس سے آپ کی نثر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"روح ترقی کے مبارک سراپا حقیقت خواب کا جس نے بالآخر حیدر آباد ایجوکیشنل سکانفرنس کی تعبیری صورت اختیار کی ایک جز نظام آصفی بھی تھا بیداری کے لئے جس چیز کی ملک کو ضرورت ہے وہ اس کی تاریخ ہے۔ زندہ قومیں اپنی قومیت کا انحصار اسی پر سمجھتی ہیں کہ اپنی تاریخ بچہ کی گھٹی میں داخل ہو۔ قوم کا بچہ آنکھ کھول کر تاریخی سبق لے بڑا ہو کر اپنے کاموں کی بنیاد رچال قوم کے نقش قدم پر رکھے اور مرنے کے بعد اسی سلسلہ فہرست میں اس کا نام داخل ہو۔ تاریخ ہی وہ تمام قوم کی زندگی کا محور ہو جس پر ملک کی عزت مبنی ہے ...."

عہد سلف | ایسے وقت میں جبکہ فاطر السمٰوات والارض یا شاہد ہستی مطلق کا جمال جہاں آرا کسی قوم میں بھی صاف نظر نہیں آتا تھا ایسے مقام میں جہاں ہر طرف پہاڑیوں کے جمے ہوئے قطار در قطار تودوں اور سخت زمین کے سوائے کوئی سرسبزی یا دل لبھانے والی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ امین قوم نور دو عالم حسن مجسم اقرا باسم ربک الذی خلق کی مبارک تعلیم آغاز کرتا ہے۔ اور تیرہ سال کی مسلسل کوشش کے بعد جب اس کا صلہ یہ دیکھتا ہو کہ قوم دنیا کو اس کے وجود سے خالی کرانا چاہتی ہے تو صدیوں کے آبائی وطن سے چھپے چھپے جدا ہوتا اور اسی خطہ کی ایک سرزمین میں جہاں کسی قدر سرسبزی بھی ہے ہجرت کر آتا ہو اب (۶۰۰) قابل جنگ مردم شماری ہو جاتی ہے۔ قوم بزور شمشیر اس آواز توحید کو خاموش کرنا چاہتی ہے۔ بدر صداقت (۳۱۳) جانبازان راہ توحید کی ضعیف جماعت میں یہی دعا کرتا ہے " اے اللہ اگر یہ چھوٹی سی جماعت آج مار ڈالی گئی تو پھر کبھی زمین پر تیری عبادت نہ ہو گی" محبت حق کی سرشار یہ چھوٹی جماعت اپنے سہ چند دولت اور رسم پرستیوں کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے"

مولوی مرتضیٰ صاحب کی ایک تالیف "تاریخ التاریخ" بھی ہو جس کے متعلق انجمن ترقی اردو نے قوم کو توجہ دلائی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا اس کے متعلق صراحت سے تنقید کی جائے۔

ے۵ تمدن حیات غیر مطبوعہ

اگرچہ یہ ایک مختصر رسالہ (۱۴۷) صفحہ کا ہے مگر مولف نے باوجود انگریزی زبان کی ناواقفیت کے جس خوبی کے ساتھ اس کو مرتب و مدون کیا ہے وہ لائق ستایش ہے۔

دنیا میں جتنے فنون ہیں ان کے متعلق عموماً یہ سوالات ہو سکتے ہیں کہ کس طرح اس کی ابتدا ہوی؟ اور کن وجوہ سے؟ کس طرح اس نے ترقی پائی؟ کیا کیا تبدیلیاں اس میں ہوگئیں؟ اور کن وجوہ سے؟

یہی سوالات ہیں جو تاریخ کے متعلق بھی کئے جا سکتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی ایک دلچسپ سوال ہو سکتا ہے کہ یورپ کا اس میں کہاں تک حصہ ہے؟ مولف مذکور نے اپنے رسالہ میں ان امور کی نسبت نہایت معقول بحث کی ہے اور نہایت عمدگی سے ان سوالات کے جوابات پر نظر ڈالی ہے پہلے وہ ہندوستان سے اس کی ابتدا کرتے ہیں رامائن اور مہابھارت کو یہاں کی تاریخ کے پہلے زینے قرار دیتے ہیں۔ مصر اور کلدانی اور عبرانی تاریخوں پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے اور موجودہ توراۃ کو اس بات کی گواہی میں پیش کیا ہے کہ تاریخ انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔

اس کے بعد آپ نے یونان سے بحث کی ہے چنانچہ اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اب ایشیا سے گزر کر یورپ کے اس آخری خطہ یونان کا نمبر ہے آیندہ زمانہ میں یونان ہی کا ڈنکا بجتے رہنے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس کی کتابیں فنا کے ہاتھ سے بچ رہیں۔ چنانچہ فلسفہ یونان کی طرح یونانی قوم کی تاریخیں بھی مشہور ہیں اور مورخین یونان کی فہرست میں اُن کی تعداد کافی نظر آتی ہے جن میں گل سر سبد ہیروڈوٹس ہے جس کو پدر تاریخ کا لقب دیا گیا ہے اس کے بعد زینیفون۔ ٹوکی ویڈ۔ ویودورس بلوٹارک کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں"

اس بحث کو انھوں نے جاری رکھا ہے اور رومی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور اس امر کو ثابت کیا ہے کہ ازمنہ مظلمہ کی پرحسرت داستان پر یورپ کے کف افسوس ملنے سے پہلے اسلامی مورخ نے اس کے متعلق مدتوں پہلے صاف صاف بیان کر دیا تھا۔

اس کے بعد عہد اسلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس امر کو نہایت جامع طور پر واضح کیا ہے کہ مسلمانوں نے تاریخ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ عہد صحابہ پر ایک سرسری روشنی ڈال کر وہ بنی امیہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور اس پر نہایت گہری نظر دوڑائی ہے اور امیر معاویہ کے عہد کو تاریخ کی بنا قرار دیا ہے اور ان کتابوں اور مصنفین کے نام قلم بند کئے ہیں۔ جو اس زمانہ میں موجود تھے۔

عبید بن شریہ کو پہلا اسلامی مورخ تسلیم کیا ہے اور الفہرست کے مطالعہ سے اس کو ثابت کرتے ہیں کہ عرب مورخین کی کائنات صرف شاہی داستان پر منحصر نہ رہی تھی بلکہ ان کے واقعہ پسند دماغوں نے یہ سمجھا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ فن تاریخ کو کائنات کی ہر چیز سے یکساں تعلق ہے۔

اس کے بعد انھوں نے علم ادب وغیرہ کی تاریخیں۔ سرکاری عہدہ داروں کی کتابیں دیگر متفرق تاریخوں کے متعلق تذکرہ کیا ہے اور پھر تاریخ کی رفتار مسلمانوں کے زمانہ میں غیر قوموں کی تاریخ پر توجہ اور مفتوح قوموں کی تاریخوں پر جدا جدا نوٹ لکھے ہیں۔ اور پھر فن سیر۔ علم حدیث اور سیر کی رفتار سے بحث کی ہے۔

بغداد کو سازشوں میں چھوڑ کر دنیا کے اور حصوں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ قاہرہ۔ اندلس ایران پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ کرنے کے بعد وہ تاریخ فلسفہ پر متوجہ ہوئے ہیں اور پھر ابوریحان کی تاریخی کتابوں الآثار الباقیہ اور کتاب الہند کو اپنی بحث کا جولان گاہ بنایا ہے اور کافی روشنی ڈالی ہے۔ متقدمین کے بعد متاخرین سے بحث کی ہے اور اقوام مغلیہ تاتار کے زمانہ میں تاریخ کی حالت اور تیموریہ نظارۂ معائنہ کرکے ابن خلدون کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اس کے آخر میں لکھا ہے کہ :-

"مصر میں ابن خلدون کے فیض صحبت سے مقریزی ایک شخص ایسا نظر آتا ہے، جس نے عام روشنی سے بالاتر "الخطط والآثار" جیسی کتاب لکھ کر عمدہ اور قیمتی معلومات کا ذخیرہ مہیا کر دیا۔ لیکن بہت جلد مصر کی علمی تازگی بھی جاتی رہی"

"لامحالہ ہماری نظر اب یہاں سے ہٹ کر اس عظیم الشان قسطنطنیہ پر پڑ رہی ہے جہاں ترکان آل عثمان نے اپنا پرچم ہلال نصب کرکے اپنے آپ کو میراث عرب کا سچا مستحق قرار دیا"

اور اب ترک کے بعد وہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تزک بابری۔ آئین اکبری اور تاریخ فرشتہ کا ذکر کرنے کے بعد "حجۃ اللہ البالغہ" کے بیان پر اس دور کو ختم کرتے ہیں اور اس کے بعد اسلامی دور پر عام رائے لکھتے ہوئے یورپ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور کتاب کو (قرآن مجید اور اصول تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے ختم کیا ہے لکھتے ہیں کہ

"جہاں ہم یورپ کے عظیم الشان ترقی علم و ادراک کے معترف ہیں تو اس کے ساتھ ہم کو اس امر کے ظاہر کرنے میں دلی انبساط ہوتا ہے کہ جس قدر علم کے قدم آگے بڑھتے جائیں قرآن مجید کا اعجاز بھی زیادہ روشن ہوتا جائے گا۔ تاریخ کا انسان

کی نطرت میں داخل ہونا جس طرح تاریخاً وعملاً مشاہدہ ہے کلام آلہی بھی اس کا ثبت ہے۔"
اسی عہد کے ایک اور مورخ حکیم سید شمس اللہ قادری ایم آر اے ایس ہیں جن کی تاریخی قابلیت
سلمہ ہے اور آپ کے مضامین ہندوستان کے سربرآوردہ رسالوں میں شایع ہوا کرتے ہیں آپ کی
تحریر کا انداز یہ ہے:-

"جس زمانہ میں آل سبکتگین کا ظہور ہوا ہے وسط ایشیا میں آفتاب علم وفن اوج وکمال
پر پہونچا ہوا تھا قریب قریب اسی زمانہ میں امام بخاری، امام مسلم، ابونصر فارابی،
بوعلی سینا، امام رازی، ابوالفضل، جوہری وغیرہ اسی سرزمین کی مردم خیز بستیوں
میں پیدا ہوئے تھے وسط ایشیا میں اس وقت جو حکومتیں قائم تھیں ان سب کے
حکمراں عموماً صاحب علم وفن اور علوم وفنون کے مربی وسرپرست تھے۔ ان حکومتوں
میں ماوراالنہر کے سامانی حکمراں سب سے زیادہ طاقتور اور ذی اثر تھے۔ علمی سرپرستی کے
لحاظ سے بھی ان کا پایہ بڑا ہوا تھا۔ اس خاندان کا تیسرا فرمان روا نصر بن احمد (۳۰۱ھ ۹۱۳ء
تا ۳۳۱ھ ۹۴۲ء) بڑا فیاض اور ہنر پرور بادشاہ ہوا ہے۔ استاد ابوالحسن رودکی جس کو
فارسی شاعری کا ابوالآباء کہتے ہیں اس کے دربار کے ملک الشعراء کے عہدے پر مامور تھا
بادشاہ کی فرمایش سے اس نے کلیلہ دمنہ کی حکایات فارسی میں نظم کی تھیں اور اس کے
صلہ میں چالیس ہزار درم کا عطیہ ملا تھا۔ عنصری اپنے ایک قصیدہ میں لکھتا ہے ؎

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش   عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور"[1]

اسی دور کے ایک مشہور فارسی کے شاعر اور انشاپرداز مولوی جلال الدین نوری ہیں۔ کلام
غالب پر آپ مبسوط شرح قلم بند کر رہے ہیں۔ ذیل میں اس کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔ جس سے
آپ کی اردو انشاپردازی کا کمال اور ادبی جوہر عیاں ہوتا ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب   اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

پہلے وہ گرد کے معنی واضح کرتے اور شعر کے کلام سے ثبوت پیش کرتے کے بعد لکھتے ہیں۔
"طرح طرح کی مصیبتیں جب کسی پر ٹوٹ پڑتی ہیں تو رنج پر رنج دے کر آسمان کا رنگ
دکھاتی ہیں اور انقلاب کا عالم نیرنگ۔ انبساط کا رنگ اکھڑ جاتا ہے اور بہار عشرت
پر خزاں آتی ہے دل پر غم چھا جاتا ہے اور شگفتگی پر اوس پڑ جاتی ہے۔ جگر جل بھن کر
کباب ہوتا ہے اور تازگی خاک میں مل جاتی ہے۔ نہ دل میں خوشی رہتی ہے نہ

---
[1] رسالہ اردو

کلیجے میں ٹھنڈک۔ رنج و مصیبت کے ہاتھوں دل و جگر خون ہو جاتے ہیں سینہ پر خون ہو جاتا ہے اور بہاؤ بڑھ کر دریائے جیحون۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ آگے مصیبت کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ عیش و نشاط کا عالم تھا اور لطف زندگی کا زمانہ عشرت کے ساماں مہیا تھے۔ رنگ محلوں میں رنگ رلیاں سوجھتی تھیں۔ دور جام چلتا تھا۔ انجام کا خیال نہ آتا تھا۔ خواب راحت میں عمر کٹتی تھی اور زندگی کا مزہ آتا تھا۔ اس کے بعد ایک دم سے ہوا بدل گئی اور خوش دلی کا ورق الٹ گیا وہ بپتا مجھ پر پڑی کہ غم و اندوہ کے بادل گرجنے اور درد و الم کے پتھر برسنے لگے چوٹ پر چوٹ کھائی اور صدمے پر صدمے اٹھایا اس لئے دل خون ہو گیا جگر لہو لہان ہو گیا ناسور سے چشمے ابلنے لگے اور خون کا ایک دریا امنڈ آیا اور لہرا کر بہنے لگا۔ اس لئے اب یہ گت بن گئی ہے کہ دل سے لے کر جگر تک دریائے خون کا ساحل ہو گیا ہے۔ روز و شب خون جگر پیتا ہوں اور غم کھا کر جیتا ہوں۔ غرض جس رہ گزر میں اب غم کا جوش طوفاں خیز اور لہو کا سمندر شور انگیز ہے آگے اسی میں غضب کی دل کشا فضائیں اور روح افزا ہوائیں تھیں۔ غم سے فراغ تھا دل باغ باغ تھا اور جگر بے داغ گویا فصل بہار آئی تھی اور دل سے جگر تک تمام رہ گزر گلزار ہو گئی تھی۔ چمن کی شادابی اور گل کی سیرابی شہرۂ آفاق ہو کر ضرب المثل ہو گئی ہے۔ لیکن خوش حالی اور فارغ البالی نے وہ پھول باغ یہاں لگایا تھا کہ سینہ بے غم اور دل خرم کی شگفتگی نے لالہ زار میں آگ لگائی۔ گلستان ارم پر بجلی گرائی، ابر نو رفلک کی آبرو برباد ہو گئی تھی ہنگامہ بہار سرد تھا اور جلوۂ گل گرد۔ مقصد اصلی اگرچہ یہی تھا کہ جلوۂ گل ناچیز اور بے حقیقت ہو گیا تھا۔ لیکن مصنف نے جلوۂ گل کی گرد رہ گزر میں اڑا کر ایک لطف مضمون پیدا کیا ہے اور وہ یہ ہے[1] ------------"

اس کے پہلے ناظرین مولوی سید غلام مصطفےٰ صاحب ذہین سے واقف ہو چکے اور آپ کی نظم ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یہاں مختصر طور پر آپ کی نثر کا نمونہ بھی پیش کیا جاتا ہے جو خالی از دلچسپی نہیں ہے۔

"وہ کشور تن کا رئیس تخت صنوبری پر متمکن اعضاء حیات پر حکمراں کہنے کو دو حرف کا نام مگر دو جہاں کے کام تفویض ملک سیرت شریعت پر ثابت قدم طریقت پر راسخ دم بصیرت کی عینک لگائے انوار قدرت کو دیکھتا ہے معرفت کا مزا پاتا ہے حقیقت

---

[1] رسالہ ترقی۔

کا لطف اٹھاتا ہے۔

مگر کوئی دل وفادار ہے کوئی بے وفا کوئی پاک ہے کوئی نجس کبھی غمگیں ہے کبھی شاد، کبھی بامراد ہے کبھی نامراد ؎

گہے بر تارم اعلیٰ نشیند گہے بر پشت پائے خود نہ بیند

اہل دل کے سینہ میں آفتاب ہے نا اہل کے چھاتی میں داغ۔ عاشق کا دل عاشق سے بیزار اور معشوق کا طرفدار عاشق کے پہلو سے نکل کر اس کو بے دل کر دیا اور اہل باطن کے سینہ میں رہ کر صاحبدل بنا دیا۔ غرض دل کے ہاتھوں کوئی شاداں ہے کوئی نالاں کوئی کہتا ہے ؎

"ہو جاؤں بھی تو جا کے کچھ مداوائے دل کروں کب تک میں دل پہ ہاتھ مرے ہائے دل کروں"

ملا عبدالقیوم صاحب مرحوم کے لایق اور قابل فرزند مولوی عبدالباسط صاحب نہ صرف عربی کے ادیب ہیں بلکہ اردو کے ایک بہترین انشا پرداز ہیں۔ ذیل میں آپ کے ایک ترجمہ مضمون کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے یہ مضمون اپنی بہتری اور خوبی کے باعث مختلف اخباروں اور رسالوں میں نقل ہوا ہے۔

اصل مضمون شیخ محمد عبدہ مفتی مصر کا لکھا ہوا ہے جس کا عنوان "اسلام و نصرانیت کا برتاؤ علم و تمدن کے ساتھ" ہے ترجمہ کو سلیس اور بامحاورہ بنانے میں لایق مترجم نے جو محنت کی ہے اس کا اندازہ کچھ وہی کر سکتے ہیں جنھوں نے اصل عربی مضمون ملاحظہ فرمایا ہے۔

"جنگجویان اسلام کسی ملک میں داخل ہوتا اور اس کو فتح کر لیتا تھا تو لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا اور ان کے دین سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتا تھا اس کے زیر حکم رعایا، اپنے اعتقادات کے موافق اپنے واجبات و فرائض ادا کرتی تھی مگر اس کی طرف کوئی آنکھ تک اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ ہاں جزیہ ان پر مقرر کیا جاتا تھا مگر اسلئے کہ ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے اور وہ امن و عافیت کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض اور دنیوی کاروبار انجام دے سکیں انھیں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی اور کسی طرح کا ظلم ان پر روا نہ رکھا جاتا تھا۔ خلفائے سلین اپنے کمانڈروں اور گورنروں کو تاکیدی احکام دیتے تھے کہ راہبوں سے تعرض نہ کیا جائے انکی عزت و حرمت کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ اور عورتوں بچوں اور معذوروں کا جان

لہ رسالہ ذخیرہ

بڑھوں کا پاس کیا جائے اور ان کا خون نہ بہایا جائے۔ اہل ذمہ کے حقوق کی حفاظت اور ان کی ایذادہی کی ممانعت میں احادیث متواترہ صادر ہوئی ہیں جن میں سے دو یہ ہیں:-

(۱) ہمارے فائدہ کے ساتھ ان کا فائدہ اور ہمارے نقصان کے ساتھ ان کا نقصان ہے۔

(۲) جس نے ذمی کو ایذا دی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

جب تک اسلام قومی رہا ان احکام پر عمل ہوتا رہا مگر جب اس میں ضعف پیدا ہو گیا تو بدنام کنندۂ نکو نامے چند، مسلمانوں نے ان ہدایتوں سے انحراف کیا۔ لیکن ان کے طرز عمل سے نفس اسلام پر کوئی داغ دھبہ نہیں لگ سکتا۔"

"صلیح جو مسیحیت کے زیر تسلط جب کوئی دوسرا مذہب آجاتا ہے تو وہ اہل مذہب کے اعمال پر سخت نگرانی شروع کر دیتی ہے اور خاص کر ان ہی لوگوں سے اس طرح کا سلوک کرنے لگتی ہے کہ اس پر صبر کئے رہنا نا ممکنات سے ہو جاتا ہے اور جہاں اسے ان کو نکال باہر کرنے کا موقع ہاتھ لگ جاتا ہے تو فوراً جلاوطنی کا حکم سنا دیتی ہے اور شہروں سے ان کے آثار تک کو پاک کر دیتی ہے [۱]"

عبدالجبار خاں صاحب آصفی:- آپ ایک مشہور مورخ ہیں۔ تذکرۂ سلاطین دکن، تذکرۂ شعرائے دکن اور تذکرۂ اولیائے دکن وغیرہ تاریخ دکن کے سلسلہ میں چھ ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ نمونہ عبارت پیش ہے جو حضرت آصف جاہ اول کے حال سے ماخذ ہے:-

"آپ کے والد ماجد یعنی میر شہاب الدین خاں المخاطب بہ غازی الدین خاں فیروز جنگ باپ کی رحلت کے بعد رفتہ رفتہ منصب ہفت ہزاری تک ترقی کی اور غازی الدین خاں فیروز جنگ عالمگیری امرا میں اکبر الامرا شمار کئے جاتے تھے عالمگیر آپ کو بڑی عظمت و محبت سے دیکھتا تھا دکن کے معرکوں میں آپ کی جان نثاری و عرق ریزی و دلیری دیکھ کے فرزندوں سے زیادہ چاہتا تھا۔ جب آپ کی کوشش و جاں نشانی سے بیجاپور کی فتح حاصل ہوئی اس وقت آپ کے خطاب کے ساتھ فرزند ارجمند کا فقرہ اضافہ فرمایا۔ بیجاپور کے معرکوں میں دکنیوں نے عالمگیری لشکر میں رسد کی آمد و رفت بند کر دی تھی۔ لشکر میں بہ سبب عدم غلہ و دانہ کھلبلی پڑی ہوئی تھی تمام بے قرار و جاں بلب ہو رہے تھے۔ عالمگیر رسد کے نہ پہونچنے کی خبر سے نہایت بے چین و بے قرار تھا

[۱] رسالہ صحیفہ

رات کے آٹھ بجے فیروز جنگ کو بلایا اور رسد پہونچانے کی بابت کہا۔ فیروز جنگ اسی وقت مستعد ہوئے معہ جمعیت و رسد ہمراہ لے کر عالمگیری لشکر میں مخالفین سے قتال و جدال کرتے ہوئے قریب چار بجے صبح کے پہونچے۔ رسد لشکر میں تقسیم کر دی گئی۔"

مولوی سید اشرف صاحب شمسی رسالہ "حسن" کے مشہور مضمون نگار۔ آپ کے اکثر مضامین پر رسالہ حسن کی جانب سے اشرفیاں نذر کی گئیں ہیں۔ صحیفہ ماہواری میں بھی آپ کے اکثر مضامین شایع ہوئے ہیں آپ کے مضمون کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ حکیم الاشراق شیخ شہاب الدین کے حالات میں تحریر کرتے ہیں:۔

"شیخ الاشراق کے فلسفی تصانیف سے صاف یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو ارسطوطالیس کے اکثر اصول فلسفیہ سے سخت اختلاف تھا۔ اگرچہ شیخ نے اپنی کتابوں میں ارسطو کے مسایل ترتیب وار ذکر نہیں کئے ہیں تاہم جس طور پر ان کا ذکر کیا ہے بغیر اعتراض و مواخذہ نہیں چھوڑا ہے۔ کلمتہ الاشراق اگرچہ بظاہر فلسفہ کی کتاب معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں یہ کتاب فلسفہ ارسطو کا رد ہے یا اس کے فلسفہ کو کمزور کر دینے والی ہے۔ اگرچہ اصول منطقیہ میں شیخ نے ارسطوطالیس سے زیادہ اختلاف نہیں کیا ہے تاہم بعض مسایل مثلاً مسئلہ تحدید و فصل وغیرہ میں ارسطو کی رائے سے بے حد مخالفت کی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ حقایق و انواع کی تحدید ان کے اوصاف ذاتی و عوارض ذاتی سے ہو جاتی ہے لہذا تحدید اشیاء کے لئے فصول ذاتیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جس جگہ شیخ ارسطو پر فصول فصول اشیا میں مواخذہ کیا ہے اس جگہ یہ بحث بھی کی ہے کہ یہ ضرورت نہیں ہے کہ جواہر کے فصول جواہر ہی ہوں بلکہ جائز ہے کہ اعراض ہوں۔ چنانچہ سریر کی حقیقت چند لکڑی کے ٹکڑے اور ہیئت سریر کے سوا کوئی چیز نہیں ہے۔"

مانک راو وٹھل راؤ صاحب حیدرآباد کے ایک قدیم خاندانی منصبدار ہیں۔ آپ کی مولفہ کئی ایک کتابیں شایع ہو چکی ہیں بستان آصفی جس کی اب تک تین جلدیں شایع ہوئی ہیں۔ حیدرآباد کی مفصل تاریخ ہے اور عام تاریخی حالات و واقعات جس قدر تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں درج ہیں وہ اور کسی کتاب میں یکجا نہیں مل سکتے۔

آپ کی ایک اور کتاب "ایرانہ غریبانہ زندگی" ہے جو انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہے اس کا نمونہ درج ہے :۔

۱ء تاریخ سلاطین دکن

"کسی گزشتہ زمانہ میں جزیرۂ صقلیہ کے شہر کیوزیں بادشاہ ہیرو سریر آرائے سلطنت تھا اس کے دربار میں ایک بڑا شاعر سائمونڈس تھا جس پر بادشاہ کی بے حد عنایت مبذول تھی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ سائمونڈس نے اثنائے گفتگو میں بادشاہ سے عرض کیا کہ جہاں پناہ میں خیال کرتا ہوں کہ آپ کی معلومات بڑھی ہوئی ہوگی۔ اگر جہاں پناہ مجھ کو اپنے معلومات سے بہرہ مند فرمائے تو بہت ہی ممنون ہوگا۔ ہیرو نے جواب میں کہا کہ اے سائمونڈس تیری معلومات کی تو دنیا پر دھاک بندہ رہی ہے تیرے مقابلہ میں میری معلومات کیا حقیقت رکھتی ہے اور میں تیرے مقابلہ میں اپنی معلومات کیا کبھار سکتا ہوں"۔

مانک راو وٹھل راؤ صاحب کے تالیف "بستان آصفی" کا انتخاب بھی مختلف مقامات سے پیش کیا جاتا ہے:۔

"راجہ رام راجہ نے سلطان ابراہیم قطب شاہ کے ملک کا کچھ حصہ دبالیا تھا اس لئے خواہ مخواہ اُسے بھی اس جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ یہ لڑائی دریائے کرشنا کے پار مشرقی جانب واقع ہوئی تھی۔ اس میں سلطان ابراہیم کو راجہ سے اس کا ملک واپس مل گیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد ایک زبردست فوج بھیجکر قلعہ ورنگل بھی فتح کر لیا"۔ ....

"سرجان شور گورنر جنرل اس زمانہ میں ہندوستان کے فرماں روا تھے ان کی طبیعت کچھ ایسی صلح کل واقع ہوئی تھی کہ وہ لڑائی کو مطلق پسند نہ کرتے تھے۔ اس وجہ سے مرہٹوں کی ہمت بڑھی اور ان کی طاقت دن بدن مضبوط ہونے لگی۔ انھوں نے سرکار نظام سے جنگ کی ٹھانی چنانچہ نواب نظام علی خاں ۱۳ر شعبان ۱۲۰۹ھ ہجری کو قلعہ کھرڈلا میں صف آرا ہوئے اور جنگ چھڑی"۔

"سالار جنگ مرحوم کے زمانہ میں ہر ایک علاقہ کی نگرانی کے لئے معتمدوں کا تقرر ہوا تھا مثلاً مال۔ عدالت۔ فوج۔ کوتوالی۔ متفرقات تعمیرات وغیرہ لیکن سررشتہ فنانس کے لئے کوئی معتمد مقرر نہ تھا بلکہ محاسبی سے راست مدارالمہام سرکار عالی کے ملاحظہ میں کاغذات پیش ہوا کرتے تھے۔ میر لائق علی خاں مرحوم عمادالسلطنتہ کے زمانہ میں حسب جریدۂ غیر معمولی مطبوعہ ۲۹ر بہمن ۱۲۹۴ف ایک جدید محکمہ پولیٹیکل وفینانس قایم ہوا"۔

"نواب فخرالدین خاں شمس الامرا ثانی نے غریب بچوں کی تعلیم کے لئے ۱۲۵۸ھ م ۱۸۴۲ء میں اپنی دیوڑھی کے اندر مدرسہ قایم کیا اور ہر غریب بچہ کو بغرض تحریص و ترغیب پندرھویں روز ایک چوانی مقرر کی۔ یہ مدرسہ اب تک نواب آسمانجاہ مرحوم کی دیوڑھی میں موجود ہے اور اس میں عربی۔ فارسی۔ انگریزی کی تعلیم مفت ہوتی ہے مدرسہ کے تمام اخراجات مرحوم کے خزانہ سے ادا ہوتے ہیں۔"

حیدرآباد میں اردو کی خدمت ایسے اشخاص نے بھی کی ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے مگر حیدرآباد کے تعلق اور حیدرآباد کی بود و باش کے باعث اردو بمنزلہ مادری زبان کے ہوگئی ہے ذیل میں اسی قسم کی ایک خدمت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ شیکسپیر کے مشہور و معروف ڈرامہ میکبتھ کا ترجمہ ہے جو "تلاطم ایران" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس کے مترجم حیدرآباد کے قدیم پارسی خاندان کے بزرگ مسٹر سہراب جی پیشتبجی کانگا سابق مددگار معتمد فنانس ہیں اولاً ترجمہ ایک شوار گزار منزل ہے اور پھر ڈرامہ کا ترجمہ اور بھی خاص حیثیت رکھتا ہے مگر "تلاطم ایران" کے مطالعہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ مترجم نے کس محنت اور کامیابی سے اس کام کو انجام دیا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب قابل قدر ہے

ہرمزن اپنے آپ مخاطب ہے۔

"یہ کوا کس قدر بھاری آواز سے کائیں کائیں کر رہا ہے جو میری چھت کے نیچے جاں کھونے والے فتح علی شاہ کے آنے کی خبر دیتا ہے۔ انسان کے دلوں میں شیطانی خیالات پیدا کرنے والے اے دیو اور جنو آؤ اور اسی وقت میرے زنانے صفات کو بدل دو اور سر سے پاؤں تک مجھے وحشت انگیز بے رحمی سے بھر دو میرا خون گاڑھا کر دو اور رحم کے دروازے بند کر دو تاکہ کوئی خلش یا رحم آمیز خیال میرے خونخوار ارادے کو متزلزل نہ کر دے اور اس کی انجام دہی میں معترض نہ ہو۔ اے خونی عفریتو جہاں کہیں تم اپنے غیر مرئی جسموں میں دنیا کی تباہی کے لئے آمادہ رہتے ہو وہاں سے آکر میری نازک چھاتی میں داخل ہو جاؤ۔ اور میرے دودھ کو زہر بنا دو۔ اے اندھیری رات دوزخ کے کالے سے کالے دھویں سیاہ کفن پہن لے تاکہ میری آبدار اور تیز چھری اپنے کئے ہوئے زخم کو نہ دیکھ سکے اور اے آسمان تو اپنی سیاہ چادر میں جھانک کر یہ نہ کہہ کہ ٹھیرو ٹھیرو یہ کیا کرتی ہو۔"

"امیر عبداللہ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے کان میری زبان سے ہمیشہ کے لئے

نفرت نہ کریں کیونکہ وہ ان کو ایک ایسی کروہ خبر سنائے گی جیسی انھوں نے کبھی نہ سنی ہوگی۔

داؤد مرزا۔ ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔

امیر عبداللہ۔ آپ کے قلعہ پر دفعتہً قبضہ کر لیا گیا اور آپ کی بیوی اور بچوں کو ظالمانہ طور پر مار ڈالا۔ یہ بیان کرنا کہ کس طرح پر ان کو قتل کیا ہے گویا ان بے گناہوں کے ساتھ آپ کی بھی جان لینی ہے۔

شاہزادہ سلیمان۔ یا کریم الرحیم۔ مرزا صاحب آپ اپنے غم کو دل ہی میں نہ رکھئے بلکہ زبان سے باہر نکالئے جو غم خاموش رہتا ہے وہ دل پر درد کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔

داؤد مرزا۔ کیا میرے بچوں کو بھی مار ڈالا۔

امیر عبداللہ۔ بیوی کو بچوں کو۔ خدمت گاروں کو اور ہر شخص کو جو ہاتھ آیا مار ڈالا۔

داؤد مرزا۔ اور میں وہاں موجود نہیں۔ کیا میری بیوی کو بھی قتل کیا۔

امیر عبداللہ۔ میں عرض کر چکا ہوں۔

شاہزادہ سلیمان۔ صبر اختیار کیجئے اور اس عظیم آفت کا معالجہ کرنے کے لئے انتقام کی دوا تیار کیجئے۔[۱]

اب تک جس قدر نثر کا انتخاب پیش کیا گیا ہے اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ دکن میں اردو کی انشا پردازی نے ترقی کے زینے کس قدر طے کئے۔

---

[۱] تلاطم ایران مطبوعہ۔

معلمِ نسواں

آج ہندوستان کے ہر حصے میں متعدد مسلمان خواتین بی اے، ایم اے اور منشی فاضل وغیرہ کی ڈگریاں رکھتی ہیں مگر آج سے پچیس تیس سال پہلے خواتین کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی۔ "تعلیم نسواں" اور حقوق نسواں کا کوئی غلغلہ تھا اور نہ کسی کو ان مسائل سے دلچسپی تھی۔ غرض ایک عام تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے اس جانب کہاں توجہ ہوئی اور اس کے متعلق کہاں سے صدا بلند ہوئی؟ دکن سے!

مولوی محب حسین ہی غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حقوق نسواں اور تعلیم نسواں کی جانب توجہ مبذول کی اور اپنے لکچروں اور کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ سالہا سال مسلسل کوشش کرتے رہے۔ آپ نے نہ صرف اسی پر اکتفا کیا بلکہ خواتین کے لئے ایک علیحدہ نصاب کیلئے بھی متعدد کتابیں نظم و نثر میں لکھیں اور آج سے بہت پہلے ان زہریلی غزلوں اور تقریباً فحش نظموں کو جو مدرسوں کے درس میں شریک تھیں نکالنے کے بانی ہوے۔

مولوی صاحب ایک کہنہ مشق شاعر بھی ہیں۔ دیوان اور کلیات شایع ہو چکے ہیں۔ دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ نے اپنی غزلوں میں کن مضامین کو نظم کیا ہے۔ اور زمانہ کے رنگ کے خلاف کس طرح دردِ دل اور قومی نوحہ کو وہ غزلوں میں بیان کرتے ہیں۔ بالمختصر یہ کہ مولوی صاحب نے اپنے رسالہ کیلئے "معلم نسواں" کا نام تجویز فرمایا تھا۔ یہی لقب آپ کے لئے بھی موزوں اور مناسب ہے درحقیقت آپ "معلم نسواں" ہیں۔ آپ کے کلام کا کچھ انتخاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ہماری قوم بھی ضدی بڑی ہے ۔۔۔ پرانی ریت رسموں پر اڑی ہے
عجب مشاطہ ہے تعلیم نسواں ۔۔۔ یہی سرمہ ہے مسی کی دھڑی ہے
ہمارے حال پر روتا ہے بادل ۔۔۔ نہیں بارش یہ اشکوں کی جھڑی ہے

علم کا ہندوستان میں قدرداں ملتا نہیں ۔۔۔ فلسفی کا اس جگہ نام و نشاں ملتا نہیں
جس کو دیکھو وہ مثال آسیا چکر میں ہے ۔۔۔ چین اک دم بھی بزیر آسماں ملتا نہیں

لہو کا جام ہے یہ ساغر شراب نہیں ۔۔۔ بھڑکتی آگ کا شعلہ ہے آفتاب نہیں

بیوہ کو وصل مرگ کا ارماں نہ ہو تو کیا ۔۔۔ دنیا میں کوئی عیش کا ساماں نہ ہو تو کیا
ریش دراز جبہ و تسبیح و صوم و حج ۔۔۔ یہ سب ہو پر صداقت ایماں نہ ہو تو کیا

عورتیں کہتی ہیں گھٹ گھٹ کے یہ زندانوں میں — کیجیے کس سے بیان حال پریشاں اپنا

درد ہمدردی نسواں کو دکھا ہی دیتے — ہوتا ممکن کسی پہلو سے دکھانا دل کا

رواج و رسم پر اچھے برے کا سب ہی مدار — رہ ثواب نہ سمجھا نہ میں خطا سمجھا

پہنکے جامہ تہذیب گو نہیں انگریز — چھپائے سے نہیں چھپتی گنواری کی صورت

عبادت تو بہت کی حور و جنت کے لئے زاہد — کیا ہے بے غرض احساں بھی کوئی تو نے انساں پر

بڑھاپے میں یہ کمسن بیویاں کیا زیب دیتی ہیں — مسلط ایک بوڑھا دیو ہے گویا پرستاں پر

انھیں کی عصمت ہی قابل فخر جو ہیں آزاد بندشوں سے — وہ خاک عفت ہی ہو جو حاصل اسیر قید فرنگ ہو کر

سخت جانی کا لکھے بیوہ کے کیا حال قلم — اس مصیبت پہ تو پتھر کا کلیجہ بھی ہے شق

گیا ہے تا بفلک درد آہ بیوہ ہند — یہ اس کے دل کے بخارات ہیں سحاب نہیں

سر کر جائیں اعدائے تعلیم نسواں — ہم اب سوئے سیف قلم دیکھتے ہیں

جب خدا ترجیح دی بیٹی کو بیٹے پر عجب — کیوں نہ ہوں مردوں سے پھر بالا و برتر عورتیں

لئے جاتے ہیں جب صناع یورپ کھینچکر دولت — تو پھر خوش حال یہ عسرت زدہ ہندوستاں کیوں ہو

ازل سے دشمنی قایم ہے حق و باطل میں — جہاں رشوت مسلط ہو عدالت پر وہاں کیوں ہو

گوری گوری یہ عورتیں جاہل — بت گھروں میں ہیں سنگ مرمر کے

سینہ زنی کو بیوہ کی تو دیکھتا رہا — اے سنگدل فلک تری چھاتی نہ پھٹ گئی

جہالت عورتوں کی زہر ہے اولاد کے حق میں — مگر نافہم اس کو بھی کوئی اچھی دوا سمجھے

خاک وہ تعلیم ہے جس سے نہ ہو عالی دماغ — پیٹھ پہ لاتے ہیں یورپ سے کتابیں لاد کے[1]

مولوی صاحب "افسر" اور "معلم نسواں" ماہواری رسالوں اور علم و عمل روزانہ اخبار کی اڈیٹری کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد کتب آپ نے تصنیف تالیف اور ترجمہ فرمائی ہیں خصوصًا عالم نسوانی کے متعلق زبان اردو میں آپ نے قابل قدر معلومات اور کتابوں کا اضافہ فرمایا ہے اور اس طرح اردو نثر بھی آپ کی زیر بار منت ہے۔ ترجمہ کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

"جہاز سے اترنے کے پہلے چالیس گھنٹے سے زیادہ عرصہ تک اسے پانی کا ایک قطرہ اور کھانے کا ایک نوالا بھی نہیں ملا تھا۔ بریسٹ کے مقام میں متواتر چھ راتوں تک وہ پیال پر پڑا رہا۔ کچھ عرصہ تک قیدیوں کو بھوکا رکھنے کے بعد اس قیدخانہ میں بھیڑ کے گوشت کی ایک ران پھینکدی گئی۔ قیدیوں نے یہ ران کتوں کی طرح

[1] دیوان محب

پیچ پوچ کر کھائی۔ بعد ازاں عمادۂ کے اعلیٰ درجے کے چال چلن کی وجہ سے جیلر نے انھیں قبضہ میں رکھنے کی اجازت دی بلکہ انھیں انگلستان جانے کی رخصت بھی اس شرط پر ملی کہ اگر وہ برٹش گورنمنٹ سے اپنے لئے کوئی مناسب معاوضہ دلانے میں ناکام ہوں گے تو اس صورت میں انھیں اپنے قید خانہ کو واپس آنا پڑیگا جب ان کا یہ کام پورا ہوچکا تو انھوں نے حتی الامکان دوسرے قیدیوں کی رہائی میں بھی بڑی سعی کی"[41]

"ہر طرف سڑکوں شوارع عام چوراہوں گلی کوچوں عام مقاموں اور دریا کے کناروں پر جا بجا عارضی دکانیں جھلکتی ہوئی چیزوں اور رنگ برنگ کے خوشنما سامان و اسباب سے ملبب نظر آتی ہیں۔ جا بجا ہر قسم کے اشیا رکھی ہیں اور ہر طرح کی چیزیں خرید و فروخت کی جاتی ہیں مگر بچوں کے کھلونے سب چیزوں سے زیادہ خرید و فروخت کئے جاتے ہیں اور انہی کی جانب سب کی رغبت ہوتی ہے۔ ان غیر معمولی کانو میں ہر قسم کے کھلونے گڑیاں اور پتلیاں بکثرت رکھی ہوتی ہیں اور واقعی یہ کانیا انسان کے مختلف اشکال و وضع کے مجموعے ہیں جہاں ہر طرح کی شکل اور ہر قسم کا لباس دکھائی دیتا ہے"[42]

زبان پر عورتوں کا اثر کسی قوم و ملک کی زبان پر جس قدر عورتوں کا اثر ہے اس قدر مردوں کا اثر نہیں۔ وہ زبان کی موجد۔ محافظ اور جلا دینے والیاں ہوتی ہیں۔ اسی اثر کی وجہ سے ہر ایک قوم کی خاص زبان اس کی زبان مادری کہلاتی ہے جس زمانہ میں قوم روم کا عروج تھا تو اس وقت اس قوم کی عورتیں اپنے بچوں کو مادری زبان کی تعلیم دیتی تھیں اور نکات فصاحت و بلاغت سکھاتی تھیں رومی عورتیں زبان کے نئے نئے محاورے تراشتی تھیں اور ثقیل الفاظ کو کاٹ چھانٹ کے درست کرتی تھیں۔ نوجوان اشخاص ان کی سوسائیٹیوں میں بیٹھ کر زبان کے عمدہ محاورے اور شستہ الفاظ سیکھتے تھے اس وقت ہمارے زمانہ میں بھی محلات کی اردو زبان مستند سمجھی جاتی تھی اور دلی اور لکھنؤ کی شریف عورتیں اس کی محافظ خیال کی جاتی تھیں میں نے خود جناب نواب مرزا خان صاحب داغ فصیح الملک کو اپنی بیوی سے بعض محاورات دریافت کرتے ہوئے سنا ہے"[43]

---

[41] رسالہ علم نسواں ۱۲ نمبر ۴ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۱۶ھ [42] جان ہارورڈ [43] میرا پہلا جرم

اخبارات، رسالے اور انجمنیں

زبان کی ترقی میں اخبارات رسالے اور انجمنیں بھی غیر معمولی مدد کا موجب ہوتی ہیں زبان کی ترقی میں ان کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر امور ان کے ذریعہ انجام پاتے ہیں جس قدر ان کی تعداد زیادہ ہوگی زبان کی اسی قدر ترقی ہوگی۔ غیر اقوام اور غیر ممالک میں اپنی زبان شایع کرنے اپنے ہم وطنوں کو زبان کے متعلق نئی نئی باتیں معلوم کرانے نئی نئی ایجاد اور نئے نئے اصلاحات سے باخبر کرنے کا ذریعہ یہی ہوتے ہیں۔

ذیل میں ایک فہرست روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات اور رسائل کی دی جاتی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ اس دور میں کتنے اخبارات وغیرہ شایع ہوئے اس فہرست سے یہ بخوبی واضح ہو کہ اخبارات کی اجرائی کے لحاظ سے بھی اس دور کو اپنے ماسبق پر فوقیت حاصل ہے۔

روزانہ

نشان سلسلہ	نام اخبار	سن اجرائی	نام اڈیٹر	کیفیت
۱	۲	۳	۴	۵
۱	ہزار داستان	سنہ ۱۳۰۱ھ	محمد سلطان عاقل دہلوی	
۲	سفیر دکن	سنہ ۱۳۰۵ھ	سید امجد علی اشہری	
۳	مشیر دکن	سنہ ۱۳۱۷ھ	مسٹر کشن راؤ	
۴	علم و عمل	سنہ ۱۳۲۲ھ	مولوی محب حسین	
۵	صحیفہ	سنہ ۱۳۲۹ھ	مولوی محمد اکبر علی مولوی فاضل	
۶	معارف	سنہ ۱۳۲۹ھ		

اخبارات ہفتہ وار

نشان سلسلہ	نام اخبار	سن اجرائی	نام اڈیٹر	کیفیت
۱	۲	۳	۴	۵
۱	اخبار شوکت الاسلام	سنہ ۱۳۰۰ھ	حاجی محمد کرمان	
۲	اخبار آصفی	سنہ ۱۳۰۱ھ	سید محمد سلطان	
۳	دکن پنچ	سنہ ۱۳۰۴ھ		

۴	اشرف الاخبار	سنہ ۱۳۰۴ھ		
۵	محبوب القلوب	سنہ ۱۳۰۷ھ		
۶	ملک و ملت	سنہ ۱۳۱۲ھ	مولوی سید احمد ناطق	
۷	نظارۂ عالم	سنہ ۱۳۱۴ھ	منشی قدرت اللہ مضطر	
۸	جام جمشید	سنہ ۱۳۱۹ھ	ابراہیم خاں	
۹	عزیز الاخبار	سنہ ۱۳۲۰ھ	شمس العلماء نواب عزیز جنگ	
۱۰	دکھنی	سنہ ۱۳۲۱ھ	مولوی محمد عبد الرحیم وکیل	
۱۱	جلوۂ محبوب	سنہ ۱۳۲۱ھ	مولوی غلام صمدانی گوہر	
۱۲	محبوب گزٹ	سنہ ۱۳۲۳ھ	منشی پیارے لال	
۱۳	المحبوب	سنہ ۱۳۲۲ھ	منشی محمد قاسم	
۱۴	بیدر گزٹ	سنہ ۱۳۳۰ھ		
۱۵	عثمان گزٹ	سنہ ۱۳۳۰ھ		
۱۶	نظامی	سنہ ۱۳۳۰ھ	امیر حمزہ[1]	

ماہوار رسالے

نشان سلسلہ	نام رسالہ	سنہ اجرائی	نام اڈیٹر	کیفیت
۱	۲	۳	۴	۵
۱	معلم شفیق	سنہ ۱۲۹۸ھ	مولوی محب حسین	
۲	ادیب	سنہ ۱۲۹۸ھ		انجمن اخوان الصفا سے شائع ہوا کرتا تھا
۳	فنون	سنہ ۱۲۹۹ھ	مولوی مشتاق احمد	
۴	حسن	سنہ ۱۳۰۵ھ	حسن بن عبد اللہ	
۵	معلم نسواں	سنہ ۱۳۱۰ھ	مولوی محب حسین	
۶	سحر بیان	سنہ ۱۳۱۲ھ	مولوی حبیب احمد تمنائی	
۷	منتخب روزگار	سنہ ۱۳۱۳ھ	مولوی سید علی رضا	
۸	افسر	سنہ ۱۳۱۴ھ	مولوی عبد الحق بی اے	ابتدا دو سال تک مولوی محب حسین اڈیٹر رہے

[1] از بستان آصفیہ، صفحہ ۵

۹	دلگداز	۱۳۱۴ھ	مولوی عبدالحلیم شرر	ایکسال تک حیدرآباد سے شائع ہوا
۱۰	پیام محبوب	۱۳۱۵ھ	مولوی غلام حسین داد	
۱۱	شمس الکلام	۱۳۱۵ھ	مولوی سلیمان مہدی	
۱۲	دبدبۂ آصفی	۱۳۱۵ھ	پنڈت رتن ناتھ سرشار	
۱۳	میڈیکل جنرل	۱۳۱۶ھ	لقمان الدولہ	
۱۴	جلوۂ محبوب	۱۳۱۶ھ	غلام صمدانی گوہر	
۱۵	محبوب الکلام	۱۳۱۶ھ	مولوی جلیل حسن	
۱۶	نسیم دکن	۱۳۱۹ھ	مولوی نادر علی برتر	
۱۷	افسانہ	۱۳۲۱ھ	مولوی ظفر علی خاں	
۱۸	دکن ریویو	۱۳۲۱ھ	مولوی ظفر علی خاں	
۱۹	معیار الانشا	۱۳۲۲ھ	سراج الدین احمد خاں	
۲۰	الہادی	۱۳۲۳ھ	غلام حسین داد	
۲۱	صحیفہ	۱۳۲۳ھ	مولوی اکبر علی مولوی فاضل	ابتداً اسکے اڈیٹر مولوی سید ذکی الدین حسن کیفی تھے۔
۲۲	خیال محبوب		مولوی عبدالسلام عرشی	
۲۳	ادیب	۱۳۲۶ھ	مولوی ظفریاب خاں	
۲۴	تاج	۱۳۳۱ھ	مولوی غلام محمد وفا	
۲۵	افادہ	۱۳۳۴ھ	مولوی مرزا نظام شاہ لبیب	
۲۶	ذخیرہ	۱۳۳۴ھ	سید ناظر الحسن ہوش لہ	

نامناسب نہ ہوگا اگر ان میں سے بعض اخبارات و رسایل کے متعلق چند تصریحات بھی کردی جائیں۔

اخبار سفیر دکن لہ روزانہ اخبارات میں نہایت مقبول اور مشہور اخبار تھا اس کے سیاسی مضامین طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مولوی سید امجد علی اشہری جیسے مشہور ذی علم اسکے اڈیٹر تھے۔

مشیر دکن لہ حیدرآباد کا مشہور اخبار ہے اپنی سلامت روی کے باعث زمانہ دراز سے اب تک برابر شایع ہو رہا ہے اولاً دکن پنچ کے نام سے ہفتہ وار شایع ہوا کرتا تھا ۱۸۹۲ء سے مشیر دکن کے نام سے

لہ ایضاً بستان آصفی وغیرہ

موسوم ہوا۔

رسالہ حسن | حیدرآباد کا مشہور اور نامور رسالہ تھا اس کے پہلے شمالی ہند میں بھی کوئی رسالہ سوائے "تہذیب الاخلاق" کے اردو میں اس خوبی کا جاری نہیں ہوا یہ باوقعت علمی ادبی رسالہ ولایتی ماہانہ پرچوں کے قدم بقدم چلنے کی کامیاب کوشش کرتا رہا۔ اس کے مضمون نگار ہندوستان و دکن کے نامور اور مشہور اہل قلم تھے۔ عمدہ مضمون کے لئے ایک اشرفی نذر کی جاتی تھی ذیقعدہ ۱۳۰۵ھ سے ذی قعدہ ۱۳۱۲ھ تک جاری رہا۔ غرضکہ علمی دنیا میں اس رسالہ نے بڑی وقعت حاصل کر لی تھی۔

دکن ریویو | یہ بھی حیدرآباد کا ایک مشہور رسالہ تھا جس کے اڈیٹر مولوی ظفر علی خاں جیسے مشہور صاحب قلم انشاپرداز تھے۔ اردو علم ادب کی جو خدمت اس رسالہ نے انجام دی ہے وہ آج تک مشہور ہے جس طرح رسالہ حسن اپنی خوبیوں کے باعث تمام ہند میں مشہور تھا اسی طرح "دکن ریویو" باوجود شمالی ہند میں رسالوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہونے کے مقبول اور ممتاز تھا۔

صحیفہ | اولاً مولوی سید رضی الدین حسن کیفی مرحوم نے اس رسالہ کو شایع کیا مگر چند ماہ بعد یہ بند ہو گیا اس کے بعد دوبارہ انجمن معارف کے زیر نگرانی مولوی محمد اکبر علی صاحب کی اڈیٹری میں شایع ہونے لگا اس رسالہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے تمام تر مضامین عموماً اہل دکن ہی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ علمی دنیا میں اس رسالہ کے علمی اور تاریخی مضامین نہایت شوق و دلچسپی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اور اکثر مضامین اپنی خوبی اور دل آویزی کے باعث شمالی ہند کے بعض رسالوں میں نقل ہوتے تھے۔ ۱۳۳۳ھ تک ماہوار شایع ہوتا رہا اس کے بعد کچھ عرصہ تک متوقف رہ کر ۱۳۲۹ھ سے روزانہ اخبار کی شکل میں شایع ہو رہا ہے۔

ماہواری رسالوں میں ذخیرہ اور افادہ بھی قابل ذکر ہیں ان رسالوں میں نظم و نثر کے بہترین قابل قدر مضامین شایع ہوتے تھے۔ دکن اور شمالی ہند کے مشہور منتخب مضمون نگار اس رسالہ میں مضمون لکھتے تھے۔

ترقی زبان کا ایک ذریعہ انجمنوں کا قیام بھی ہے جس سے خیالات میں جولانی اور معلومات میں وسعت ہوتی ہے یوں تو حیدرآباد میں متعدد انجمنیں قایم ہوئیں اور اپنی اپنی حد تک انھوں نے کامیابی سے کام بھی کیا۔ لیکن اس وقت صرف چند مشہور انجمنوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

انجمن ترقی اردو | ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ میں زبان اردو کی ترقی کے لئے یہ انجمن قایم ہوئی اس کا

۱؎ لسیتان آصفی

مقصد زبان اردو کی بقا اور اس کی ترقی ہے۔ زبان اردو میں بذریعہ تراجم و تالیفات علمی ذخیرہ کا اضافہ بھی اس انجمن کا ایک مقصد اعظم ہے۔ اعلیٰحضرت غفران مکان علیہ الرحمہ نے نہایت خوشی کے ساتھ اس کی سرپرستی قبول فرمائی تھی اور اولاً اس کے معتمد مولانا شبلی مرحوم مقرر ہوئے تھے۔

یہ آج تک قایم اور برابر ترقی کے زینے طے کر رہی ہے آج کل اس کے معتمد اردو کے مشہور انشا پرداز مولوی عبدالحق صاحب بی اے ہیں جن کی جمیلہ مساعی اور انہاک خدمت اردو قوم کیلئے باعث تقلید ہے مولوی صاحب کی کوشش نے انجمن کی جانب سے اعلیٰ درجہ کی کتابیں شایع کرائی ہیں انجمن کا ایک سہ ماہی رسالہ بھی جاری ہے جس کے بہترین مضامین ہر طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انجمن کی مالی حالت بھی اچھی ہے۔ مستقل آمدنی ہے۔ بہرحال زبان اردو کے بقا و ارتقا میں انجمن کی سعی باعث تشکر ہے۔ اس انجمن کا قیام بھی دکن میں ہوا۔ اور نشو و نما بھی یہیں ہوی۔ کیا اردو زبان کی یہ خدمت دکن کی ممنون احسان نہیں ہے؟

ایجوکیشنل کانفرنس | اس کانفرنس کا قیام ۱۳۲۲ھ میں ہوا اس کے مقاصد کے منجملہ ایک مقصد اصلاح تعلیم تھا اس کے متعلق کانفرنس کا پروگرام حسب ذیل تھا۔

"(الف) علوم و فنون کے تراجم اردو زبان میں کئے جائیں۔

(ب) حیدرآباد کی تاریخ اور جغرافیہ اردو میں مرتب کرائے جائیں۔

(ج) ملک کی ترقی کے لئے ملکی زبان یعنی اردو میں ایک موزوں و مناسب حال نصاب تعلیم مہیا کیا جائے۔

(د) اپنی تعلیم اپنے ہاتھ ہونے کے لئے ایک یونیورسٹی کا قیام"

کانفرنس اپنے نظام العمل میں کہاں تک کامیاب ہوی وہ ابنائے وطن پر عیاں ہے۔ وہ اپنے ان مقاصد کی تکمیل کی جانب اول روز سے متوجہ ہوی نہ صرف زبانی تحریکات سے اس نے اپنے قیام کے مدعا کو پورا کیا بلکہ عملی حیثیت سے بھی توجہ کی۔

کانفرنس نے زبان اردو کی ترقی میں پہلے سالانہ اجلاس میں جس کے صدر مسٹر حیدری (نواب حیدر نواز جنگ بہادر) تھے۔ حسب ذیل تحریکیں منظور کی تھیں۔

(۱) اس کانفرنس کو اردو میں علوم و فنون کے تراجم و تصانیف کی اشاعت کی ضرورت سے پورا اتفاق ہے اور اس کے لئے یہ جلسہ سرکار عالی کی مزید توجہ کا طالب اور مستدعی ہے کہ محکمہ سررشتہ علوم و فنون کے اخراجات سالانہ سے بہترین تراجم علمی تصانیف اردو پر انعامات

مرحمت کرنے کے لئے منظور فرمائے جائیں۔
ایک اور تحریک تعلیم صنعت و حرفت کے متعلق تھا جس کا آخری حصہ یہ ہے۔
(۲) کانفرنس کی رائے میں انجنیرنگ اسکول کو ترقی دے کر سول مکانکل الکٹریکل تعلیم کا ہائی اسکول بنایا جائے جس میں ورکشاپ اور سررشتہ برقی کے ذریعہ سے عملی تجربہ کا بھی بندوبست ہو اور عام فائدہ کی غرض سے تعلیم اردو میں ہونی چاہیئے۔
(۳) ایک اور تحریک طبی تعلیم کے متعلق یہ تھی۔
کانفرنس کی رائے میں طبی تعلیم کی ترقی اور ملک کو کافی طور سے فائدہ پہونچانے کی غرض سے کم از کم سب اسسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم حسب سابق اردو میں ہونا مناسب ہے۔
کانفرنس نے اپنے دوسرے سالانہ اجلاسوں میں بھی ان امور پر توجہ دلانے کا سلسلہ قائم رکھا المختصر اردو کی توسیع اور ترقی میں اس کا بھی حصہ رہا ہے۔

دیگر انجمنیں | چند دیگر انجمنوں کا مختصر حال بھی نامناسب نہ ہوگا کیونکہ اردو کی اشاعت و ترقی میں ان مجالس کے علمی صحبتیں بھی ضرور کچھ نہ کچھ اثر پھیلاتی رہی ہیں۔

اقبال کلب | حیدرآباد کی یہ ایک مشہور انجمن تھی جو ۱۳۱۰ف میں قائم ہوی ہر جمعہ کو اس میں بڑی پابندی سے لکچر ہوا کرتے تھے ملک کے نوجوان اور عمر رسیدہ بزرگ پہلو بہ پہلو تبادلۂ خیالات کرتے اور ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے۔ کامیاب مقرروں کی تمغوں سے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ عرصہ دراز تک یہ انجمن کامیابی کے ساتھ قائم رہی اور اس کے سکرٹری افضل علی مرحوم کے مرنے پر بند ہوگئی۔

عثمانیہ ریڈنگ روم | سنہ ۱۹۰۴ء میں یہ انجمن قائم ہوی اس کے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہے مہینہ میں ایک دو مرتبہ لکچر بھی ہوا کرتے ہیں۔ یہ انجمن اب تک اپنا کام کئے جارہی ہے۔

انجمن ثمرۃ الادب | سنہ ۱۳۱۴ف میں یہ انجمن مدرسہ دارالعلوم میں قائم ہوی طلبہ میں عام معلومات کی توسیع اس کا خاص مقصد تھا انجمن کے متعلق ایک کتب خانہ اور دارالاخبار بھی قائم تھا۔ ہفتہ وار لکچر بھی ہوا کرتے تھے۔ مولوی عبدالباسط مولوی اکبر علی مولوی رضی الدین حسن کیفی اور حافظ محمد مظہر جیسے اصحاب اپنے زمانہ طالب علمی میں انجمن کے روح رواں تھے۔ اگرچہ مولوی محمد عبدالقدیر صاحب مدرس دارالعلوم انجمن کے معتمد تھے مگر دیگر اساتذہ کے دلچسپی نہ لینے اور اس کے روح رواں کے اپنی تعلیم ختم کرلینے کے باعث تقریباً تین سال کے بعد انجمن ٹوٹ گئی۔ سنہ ۱۳۲۴ف میں جبکہ مولوی

---
(۱) داستان آصفی

حمیدالدین صاحب بی اے صدر دارالعلوم ہوئے تو پھر سے انجمن زندہ ہوئی حسب سابق کتب خانہ اور دارالمطالعہ قائم ہوا۔ کبھی کبھی طلبہ کی تقریریں بھی ہوا کرتی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد انجمن کامیابی کے ساتھ چلنے لگی۔ سرکار سے بھی ماہواری امداد مقرر ہوئی۔ اس کے کتب خانہ میں اردو کے تقریباً کل مشہور و معروف کتابیں جمع ہوگئیں۔ دارالمطالعہ میں اخبارات اور رسایل کی ایک کثیر تعداد آنے لگی جو شاید حیدرآباد میں کسی انجمن میں آتے ہوں۔ اب انجمن کے دوسرے مقاصد کی تکمیل کے لئے عام لکچرز کا سلسلہ مقرر ہوا۔ مہینہ میں ایک مرتبہ علمی اور اخلاقی لکچر ہوا کرتے تھے مقررین میں نہ صرف مشاہیر اہل ملک ہی ہوتے تھے بلکہ شمالی ہند کے مشہور و معروف اصحاب بھی تقریریں کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد حلقہ قرآن کے نام سے ہر ہفتہ ایک جلسہ ترتیب دیا جاتا تھا جس میں صرف قرآن شریف کے متعلق اردو میں تقریر ہوتی تھی۔ قیام انجمن کے چوتھے سال ایک علمی اور اخلاقی ماہوار رسالہ بنام "ثمرۃ الادب" بھی جاری ہوا۔ غرض پانچ سال کے عرصہ میں انجمن نے کافی ترقی کی تھی۔ لیکن اس کے بعض سرگرم ارکان کے سلسلہ تعلیم کے ختم ہو جانے کے سبب یہ انجمن بھی ختم ہوگئی اور غالباً اس کا کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے "یونین" میں شامل کر لیا گیا۔

سررشتہ علوم و فنون کا قیام | یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہر زبان میں علوم و فنون کی ابتدا غیر زبان کے ترجمہ سے ہوتی ہے اور آگے چل کر انہی ترجموں سے جب معلومات میں وسعت خیالات میں بلندی پیدا ہوتی ہے تو نئی نئی کتابیں تالیف اور تصنیف ہونے لگتی ہیں اور ملک میں علما و فضلا کے ساتھ ساتھ موجدین اور بانیان فن کا ظہور ہونے لگتا ہے۔

اگرچہ سلطنت آصفیہ میں اس کام کی ابتداء دور ثانی میں ہی ہو چکی تھی مگر وہ صرف ایک امیر کی ذاتی کوشش تھی اور ملک میں عام طور پر کوئی تعلیمی ہل چل اور ذوق و شوق نہیں تھا اس لئے اس منزل میں چند کتابوں کے ترجمے سے آگے قدم نہ بڑھ سکا۔ اس تیسرے دور میں اس کام میں بھی کافی وسعت و ترقی ہوئی۔ اسی غرض سے شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی کی نگرانی میں ایک سررشتہ علوم و فنون کے نام سے قایم ہوا اور شایع شدہ کتابوں کو "سلسلہ آصفیہ" کے مبارک نام موسوم کیا گیا۔ صاحب موصوف کے زمانہ میں کئی کتابیں مختلف زبانوں سے انگریزی وغیرہ سے ترجمہ ہوئیں۔ شمس العلما سید علی بلگرامی کے بعد شمس العلما مولانا شبلی نعمانی اس محکمہ کے ناظم مقرر ہوئے انھوں نے اس سلسلہ کے لئے بطور خاص چند کتابیں تالیف و تصنیف فرمائیں۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ طے پایا کہ اعلیٰ تصنیف یا تالیف کے پیش ہونے پر صاحب تصنیف یا تالیف کو ایک معقول

رقم امداد دی جائے اور وہ کتاب سلسلہ آصفیہ میں داخل کرلی جائے۔ اس سلسلہ کی بعض کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

شمار	نام کتاب	فن	نام مصنف یا مترجم	کیفیت
۱	ترجمہ روزنامچہ بے ٹیورنر فرانسیسی	سفرنامہ	مولوی سید علی بلگرامی	سلسلہ آصفی جلد اول
۲	" " حصہ دوم	"	"	" دوم
۳	نظام اکبری	تاریخ	"	" سوم
۴	تاریخ دکن حصہ اول	"	"	" چہارم
۵	تاریخ دکن حصہ دوم	"	"	" پنجم
۶	الغزالی	سوانح	مولوی شبلی نعمانی	" ششم
۷	علم الکلام	فلسفہ	"	" ہفتم
۸	تاریخ دکن حصہ سوم	تاریخ		" ہشتم
۹	الکلام	فلسفہ	مولوی شبلی	" نہم
۱۰	الفاروق	سوانح	"	"

دور سوم کے واقعات ختم ہو چکے۔ صفحات گزشتہ میں جو حالات بیان کئے گئے ہیں اُن سے "اردو" کی ترقی کی رفتار کا کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ اب اس دور سے ہم رخصت ہوتے ہیں۔

دور رابع

۱۳۳۶ ہجری تا ۱۳۴۷ ف

اب ہم دور رابع میں پہونچتے ہیں۔ جس کی ابتدا ۱۳۳۶ ہجری سے ہوتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے متعلق منشور خسروی مرقوم ۱۶ ذی حجہ ۱۳۳۶ ہجری صادر ہوکر نئے دور کا آغاز کرتا ہے۔

اس مضمون کے ابتدائی حصوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اردو کو ادبی عزت سب سے پہلے دکن ہی نے بخشی تھی جبکہ صدیوں بعد بھی دہلی میں ریختہ کا کوئی دیوان مرتب ہونے پایا تھا اور نہ کوئی کتاب مدون ہوئی تھی۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے دربار کو نواسنجان اردو اپنی گل افشانی سے لالہ زار بنائے ہوئے تھے۔ مجالس عزا مرثیہ گو اپنی نوحہ خوانی سے گرماتے تھے۔ اسی طرح اب بھی اس کی تکمیل وارتقاء کی امید دکن ہی سے وابستہ نظر آتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام جس کا مقصد اردو زبان میں اعلیٰ علوم و فنون کی تعلیم دینا ہے اس سے آیندہ حیدرآباد تمام دنیا میں علم و حکمت کا ایک اہم عظیم الشان مرکز ہو جائے گا۔

اس دور کی خصوصیت اور اہمیت نہ صرف جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے بلکہ اور بھی خصوصیات اس دور کے نمایاں ہیں۔

کلام اعلیٰحضرت اقدس و اعلیٰ

اس دور کی ایک نہایت اہم اور ممتاز خصوصیت اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع مدظلہ وخلد اللہ ملکہ کا کلام لطافت نظام ہے جو بہ لحاظ بلندی مضمون و جدت خیال و خوبی بندش و لطف زبان بے نظیر ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تعریف سے مستغنی اور ستایش سے اعلیٰ و ارفع ہے بمصداق کلام الملوک ملوک الکلام۔ ملاحظہ ہو:-

تعلق دل سے ایسا ہے خیال روئے جاناں کو ۔۔۔ کہ ربط باہمی رہتا ہے جیسے جسم سے جاں کو
روانی ہے وہ اشک چشم گریاں میں کہ جس سے ہے ۔۔۔ خجالت ابر باراں کو ندامت بحر عماں کو
مری آہ رسا نے بڑھ کے سید ھا کر دیا ایسا ۔۔۔ جسے بھی بل نہیں دیتے ہیں اب زلف پریشاں کو
قیامت ہے الٰہی گردش چشم ستمگر بھی ۔۔۔ خجل کرتی ہے کیا کیا گنبد گردوں گرداں کو
رواں ہوکر نسیم صبح دم شاداب کرتی ہے ۔۔۔ سمن کو۔ نسترن کو سنبل و ریحان کو نعماں کو
خیال روئے رنگیں وہ چمن دل میں کھلاتا ہے ۔۔۔ کرے شرمندہ جس کی ہر کلی صحن گلستاں کو

بحق حضرت خیر الوریٰ صلعم یارب زمانے میں
ہمیشہ شادماں رکھ میر عثماں علی خاں کو

ولہ

کفیل حسرت و آرام جانِ ناتواں تو ہے
ہجوم ناامیدی میں طبیب مہرباں تو ہی

کسی کے روئے رنگیں سے دلِ شیدا یہ کہتا ہے
مرے گلزار مقصد کی بہار جاوداں تو ہی

کوئی کیا تجھ کو اے ایمائے چشم پرفسوں سمجھے
تعلق یہ بتاتا ہے کہ اک رازِ نہاں تو ہی

تری کیا بات ہو اے خط و خالِ عارضِ جاناں
ہمیشہ جو پھلا پھولا رہے وہ بوستاں تو ہی

تجھی سے ربط فیما بین اے اخلاص قائم ہے
دلوں کے واسطے رسم حساب دوستاں تو ہی

مجھے داغ محبت کیوں نہ ہم دل سے لگا رکھیں
علاج تابشِ مہر قیامت بے گماں تو ہی

برابر آجائے قبضہ میں وہاں بھی ہو تری شاہی
دکن کا جس طرح اس وقت عثماں حکمراں تو ہی

ولہ

انتہا جور و ستم کی ستم ایجاد بھی ہے
خاک عشاق کی پامال بھی برباد بھی ہے

ہمہ تن گوش ہیں گل نغمۂ بلبل کے لئے
سننے والا کوئی آہِ دلِ ناشاد بھی ہے

حلقۂ دام علائق میں نہیں کوئی اسیر
گلشن دہر میں طائر کوئی آزاد بھی ہے

ظلم ہو جور ہو سب کچھ ہے گوارا ہم کو
تو ہے سفاک تو دل خوگر بیداد بھی ہے

کھینچی ہے خامۂ قدرت نے وہ صورت تیری
دنگ مانی بھی ہے حیرت زدہ بہزاد بھی ہے

دو دو غماز ہیں عشق چھپاؤں کیوں کر
چشم خونبار بھی و لب فریاد بھی ہے

ایسے گلشن میں کہاں چین میسر عثماں
جس میں گلچیں بھی ہے صیاد بھی جلاد بھی ہے

ولہ

پیچ میں رکھے گی سب کو زلف پیچاں کوئی ہو
طوق ہو چکر میں یا زنجیر نالاں کوئی ہو

رنگ جم سکتا ہو کس کا لعل لب کے سامنے
گل ہو یا لالہ ہو یا لعل بدخشاں کوئی ہو

ہوتی ہو عبرت گل و شبنم کا عالم دیکھ کر
کیا تماشہ ہے کوئی گریاں ہو خنداں کوئی ہو

پنجۂ دست جنوں کو چاک کرنے سے غرض
دامن عاشق ہو یا گل کا گریباں کوئی ہو

اپنے غمزوں کو سکھاتے ہیں وہ پھر قتل عام
تیغ کوئی ہو سناں کوئی ہو پیکاں کوئی ہو

کیوں نہ کھل جائیں برنگ گل سے زخم جگر
صورت باد بہاری جب خراماں کوئی ہو

سامنے تیرے ہیں سب طفل دبستان جنوں
قیس ہو وامق ہو یا فرہاد عثماں کوئی ہو

دیگر

تجلی دیکھ کر آئینہ ساں روئے منور کی — کسی کے سامنے میں بن گیا تصویر پتھر کی
تمہاری آنکھ کی گردش ہے چکر میری قسمت کا — تمہارا چال چلنا چال ہے میرے مقدر کی
وہ مےکش ہوں کہ مستی میں ابھی یہ منہ سے نکلتا ہے — الٰہی دل مجھے شیشے کا دینا آنکھ ساغر کی
نظر پڑتی ہے کس کس کی عنادل کے نشیمن پر — خزاں کی باغباں کی برق کی گلچیں کی صرصر کی
مزہ دیتا ہے کیسا خون بسمل کا رواں ہونا — دوبالا ہو گئی ہے باڑھ دیکھو اپنے خنجر کی
جواب اک اک ادا کا دے رہا ہے کس صفائی سے — یہ آئینہ نہیں اے یار ٹکر ہے برابر کی
اگر گوش حقیقت سے سنے کوئی تو اے عثماں — صدا ہے پردۂ ناقوس میں اللہ اکبر کی

دیگر

نہاں نظر سے ہو اور روئے یار مشکل ہے — اب اپنے دل پہ ہمیں اختیار مشکل ہے
کسی کے غمزہ و انداز ناز نے دل پر — کئے وہ ظلم کہ جن کا شمار مشکل ہے
ہزار بار تمھیں آزما کے دیکھ لیا — تمہارے وعدوں کا اب اعتبار مشکل ہے
نگاہ ناز اک آفت ہے مرغ جاں کیلئے — یہ تیر وہ ہے کہ جس سے فرار مشکل ہے
غم رقیب میں تم کو نہ خاک اڑانی تھی — ہمارے دل سے یہ جائے غبار مشکل ہے
میں اس چمن کا ہوں مرغ ترانہ سنج جہاں — ترا گذر بھی نسیم بہار مشکل ہے
پڑی ہے بادۂ تر کی جو چاٹ اے عثماں — بہار گل میں یہ جائیگی ہزار مشکل ہے

دیگر

کیا محفل ہستی کا نقشہ متغیر ہے — ساقی ہے نہ مطرب ہے شیشہ ہے نہ ساغر ہے
غم سے نہ فراغ اس کو سوئے سے نہ وہ خالی — دل ہے تو عجب دل ہے سر ہے تو عجب سر ہے
سوتے سے جب اٹھے گا اک حشر بپا ہوگا — وہ فتنۂ خوابیدہ جو فتنۂ محشر ہے
تلوار جو کھینچی ہے حاضر ہے گلا میرا — دل میں ہے وہی میرے جو آپ کے لب پر ہے
انداز ترے قاتل سب جان کے دشمن ہیں — چتون ہے کہ ناوک ہے غمزہ ہے کہ خنجر ہے
جو برق گراتی ہے وہ ہے نگہ جاناں — جو دل کو پھنساتی ہے وہ زلف معنبر ہے

اب چشم عنایت سے پیاس اسکی بجھا دیجے
بیتاب بہت عثماں یا ساقی کوثر ﷺ ہے

قطعہ

تاج ہے فرقِ نبی کا فتدلیٰ کیا ہے — قاب قوسین سے ظاہر ہے کہ رتبہ کیا ہے
منکر قولِ شفاعت سے یہ پوچھے کوئی — معنی آیت یعطیک فترضیٰ کیا ہے

ولہ

چھپائے روئے احمد سے ابھی روشن ہو گھر میرا — کشش اپنی ذرا دکھلائے جذبِ دل اگر میرا
لبوں پر آگئی جانِ حزیں طولِ شبِ غم سے — صبا کہہ دے مدینے جاکے حالِ مختصر میرا

دیگر

جس دم حقیقت مئے عرفاں پدید ہو — حاصل مذاق کیفیت بایزید ہو
عثماں طلب ہے قربِ خدا کی تو چاہیئے — دل محوِ ذوقِ آیۂ حبل الورید ہو

دیگر

جنابِ مصطفیٰ پر رات دن صلِ علیٰ کہیے — صفات و نعت لکھئے مدح و تحسین و ثنا کہیے
کمال دین و ایماں کی اگر خواہش ہے اے عثماں — خدائے پاک سے حبِ نبی کی التجا کہیے

دیگر

گل کھلاتا ہے عجب رنگ تغزل تیرا — مرغ سدرہ کی ہے پرواز تخیل تیرا
یہ حکومت یہ فتوت یہ جلالت عثماں — قابل رشک ہے عالم میں تجمل تیرا

دیگر

اہل دکن کو یارب یہ انجمن مبارک — ہو ابرِ فضلِ باری سایہ فگن مبارک
سن کر نوید شادی غنچے چٹک کے بولے — پھولا پھلا یہ گلشن شاہ زمن مبارک
سرسبز ہو الٰہی نخلِ مرادِ شاہی — حق کی عطا کا گلشن شاہ دکن مبارک
گلشن مہک رہا ہے بلبل چہک رہے ہیں — قمری کی ہے زباں پر سروِ چمن مبارک
تو نے خطاب اعلیٰ پایا جو بے بہا ہے — شاہ دکن یہ تجھ کو لعل یمن مبارک
آراستہ ہیں کیا کیا ہر سمت شاہد گل — بلبل یہ کہہ رہی ہے غنچہ دہن مبارک
خالق سے التجا ہے عثماں کی یہ دعا ہے — دشمن کو ہو جہاں میں رنج و محن مبارک

جامعہ عثمانیہ | دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا راز تعلیم میں مضمر ہے۔ علم ہی ایک ایسی دولت ہے جو جاہل سے جاہل قوم کو بھی کتم عدم سے منصۂ وجود پر جلوہ گر کرا سکتا ہے۔ جہالت کی

پستی سے بام ترقی پر پہونچا سکتا ہے۔ وحشت کی تاریکی سے مدنیت کی روشنی میں لاسکتا ہے دنیا کے قدیم اور متمدن اقوام کی جہالت کے افسانے پڑھو اور پھر انکی ترقی کے اسباب و وسایل پر نظر ڈالو تو تمھیں یہ امر مہتاب کی طرح تاباں اور آفتاب کی طرح درخشاں نظر آئیگا۔ عربوں کی جہالت اور وحشت کی داستانیں تاریخ سے پنہاں نہیں۔ آسمان یورپ کی منور اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی روشنی اپنے اندر سیاہ اور تاریک جہالت کے بادل رکھتی تھی۔ جاپان کی نمایاں ہستی وحشت کے گھنگھور گھٹائیں پوشیدہ تھی۔

وہ علم ہی ہے جس نے عربوں کو بحر اوقیانوس سے دیوار چین تک اور بحیرہ خضر سے راس کماری تک قابض و متصرف کرا دیا۔ اور آسمان شہرت پر آفتاب و مہتاب کی طرح چمکایا۔ آج یورپ اور امریکہ اپنے کمالات کی وجہ چار دانگ عالم میں مشہور ہیں اور عالم کو اپنی ایجادات سے مسخر کئے ہوے ہیں۔ یہ سب اسی علم کی بدولت ہے۔ غرض دنیا کے عروج و ترقی اور عقبےٰ کی سعادت و نجات کا کلید بردار علم ہے۔

مادری زبان میں تعلیم کی ضرورت پر اس وقت کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ اس کو اب عام طور پر ماننے میں تامل نہیں کیا جاتا۔

یوں تو سلطنت آصفیہ کی سرکاری زبان اردو ہو چکی تھی مدارس میں اردو کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ علمی اور اخلاقی رسالے اردو میں شائع ہوتے تھے۔ اردو کی ترقی کے لئے انجمنیں قائم تھیں نامور اور باکمال ناظم اور ناثر موجود تھے۔ عمدہ عمدہ نظمیں کہی جاتی تھیں۔ بہترین کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ سب کچھ تھا مگر اردو کے مستقل دار الفنون یا دوسرے الفاظ میں یونیورسٹی کا وجود نہیں تھا۔ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ ہوتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچے غیر زبان کے دشوار گذار منزلیں طے کرنے اور سنگلاخ زمین عبور کرنے پر مجبور کئے جاتے تھے۔ ہماری عزیز اولاد کی گراں مایہ عمر کا ایک حصہ صرف غیر زبان کے ابتدائی مراحل طے کرنے میں صرف ہو جاتا تھا فی صد دو ایک جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے تو اکثر و بیشتر اُن کی جسمانی و دماغی حالت خراب ہو جاتی تھی۔ تعلیم کے حقیقی نتائج بھی حاصل نہیں ہوتے تھے۔ ان تمام امراض کا علاج اردو یونیورسٹی کے سوا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔

۲۲ اپریل ۱۸۸۵ء/۱۳۰۲ھ وہ دن تھا جبکہ باغ عامہ میں عماد السلطنت سر سالار جنگ ثانی مدار المہام وقت نے نظام یونیورسٹی کی خیالی بنیاد ڈالی تھی۔ جلسہ کے بعد چند دن تک تو اس کا خیال تازہ رہا مگر بہت جلد وہ خیالی صورت صرف تصویر ہی تصویر ہو کر رہ گئی اور اب جلسہ کی شان اور

کارروائی اخباروں کی پرانی شلوں میں دفن ہے۔ لیکن

بعد خزاں بہار کا آنا ضـــــرور ہے

زمانہ نے کروٹ بدلی۔ موسم کی حالت بدل گئی۔ خزاں کی جگہ بہار نے لینی شروع کردی۔ باغ کے پژمردہ درخت سرسبز اور شاداب ہونے لگے۔ پتیوں کے ساتھ ساتھ پھول اور پھل بھی پیدا ہونے لگے۔ درختوں کی عریاں شاخیں برگ و بار سے بار آور ہو کے جھومنے لگیں۔ پھولوں کی مہک سے چمن کی ہوا معطر ہونے لگی۔ نسیم صبح اپنی خوشبو و خوش خرامی سے دماغوں کو مسرور کرنے لگی۔ شبنم کے باریک باریک قطرے ہری ہری گھاس کے سبز مخملی فرش پر موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آنے لگے۔ نونہالان چمن کے لئے نوید جاں پرور پہونچی۔ شاہد مقصود نے ہمکناری سے سرور حاصل کیا۔ محب کی آنکھیں محبوب کے جلوہ دیدار سے مشرف اور مسرور ہوئیں یعنی منشور خسروی نے قیام جامعہ عثمانیہ کا مژدۂ جاں بخش سنایا۔

مسٹر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر کو تعلیم سے خاص دلچسپی رہی ہے آپ کا تعلیمی انہماک اور سرگرمی قابل تقلید ہے۔ آپ کے بہترین خیالات اور جذبات کے نمونے حیدرآباد اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبات ہیں خود عثمانیہ یونیورسٹی بھی آپ کے نتیجہ فکر اور خیالات کی زندہ جاوید یادگار ہے۔

معتمدی عدالت و تعلیمات کی کرسی پر جب آپ متمکن ہوئے تو آپ نے اپنے دلی خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی طرف عنان توجہ کو منعطف کیا۔ ۱۳۳۶ھ م ۱۹۱۷ء میں آپ نے اعلیحضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کی پیشگاہ میں ایک عرضداشت پیش کی جس میں آپ نے تعلیم کی موجودہ حالت کی پوری کیفیت تحریر کرتے ہوئے ان نقصانات سے بحث کی جو غیر زبان کے ذریعے تعلیم دینے سے واقع ہوتے ہیں۔ آپ نے اُن نقائص کو بتایا جو موجودہ طریقہ تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان اعتراضات کو بیان کیا جو اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے سے ہو سکتے ہیں اور پھر ان اعتراضات کے جوابات نہایت مدلل اور تشفی بخش دئیے۔ آپ نے عرض کیا تھا:۔

”موجودہ طریقہ تعلیم کی دورنگی اور بے اصولی کو مٹانے اور اُن خطرناک و تباہ کن نقائص کو رفع کرنے کے لئے جو موجودہ طریقہ تعلیم نے پیدا کئے ہیں اور جو گھن کی طرح ہمارے نظام تمدن و معاشرت و قوائے دماغی و جسمانی کو اندر ہی اندر کھائے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں ایک جدید یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس کی بنیاد صحیح

اصول تعلیم ملکی ضروریات اور قومی خصایص پر قائم ہو جس میں قدیم و جدید دونوں طریقوں کی خوبیوں سے فائدہ اٹھایا جائے جو تعلیمی بھی ہو اور امتحانی بھی اور ساتھ ہی تالیف و ترجمہ کا کام بھی کرے اور جو ترتیب ذہن اور تحصیل علوم و فنون کے لئے اپنی ہی زبان یعنے اردو کو کام میں لائے"۔

اعلیٰحضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے جن کی توجہ اور دلچسپی امور ریاست میں عموماً اور تعلیم میں خصوصاً مشہور زمانہ ہے اور جن کے سریر آرائے ریاست ہونے کے ساتھ ہی ترقی و زندگی کی ایک جدید لہر تمام ملک میں دوڑ گئی ہے اور جن کے دریائے فیض سے صدہا علمی چشمے سیراب ہو رہے ہیں۔ ہر ہر گوشہ کے ارباب علم اصحاب تقویٰ چن چن کر تفکرات دنیوی سے فارغ البال کئے جا رہے ہیں تا ان کے فیوض سے دنیا منور ہو جائے۔ عرضداشت محولہ بالا کو منظور فرما کر اپنی سرپرستی کی عزت سے مفتخر و ممتاز فرمایا حقیقت یہ ہے کہ اگر حضرت اقدس و اعلیٰ کی ذات شاہانہ فیض کریمانہ اور ہدایت خسروانہ اس تحریک کی رہنما نہ ہوتی تو کسی قسم کی کوئی کامیابی ناممکن و محال تھی۔ ارشاد خسروی و فرمان شاہی کی عبارت یہ ہے:۔

"مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کی مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی قایم کی جائے جس میں قدیم مشرقی اور مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقایص دور ہو کر جسمی اور دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دی جائے۔ اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بہ حیثیت ایک زبان کے ہر طالب العلم پر لازمی گردانی جائے لہذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکورہ اصول محولہ عرضداشت کے موافق ممالک محروسہ کے لئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قایم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے اس یونیورسٹی کا نام (عثمانیہ یونیورسٹی) حیدرآباد ہوگا"۔

اس فرمان واجب الاذعان کی تعمیل میں محکمہ تعلیمات نے عملی کام کا آغاز کیا ماہرین فن کے مشورہ ورائے سے شعبہ فنون اور دینیات کے نصاب مقرر کیے گئے اور تعلیمی حلقوں میں گشت کرائے گئے۔ جامعہ عثمانیہ کے نصاب تعلیم کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مٹریکولیشن کے امتحانی مضامین میں اس طرح تخفیف کی ہے کہ بعض مضامین کے متعلق افسران مدارس کا صداقت نامہ کافی قرار دیا ہے امتحان انٹرمیڈیٹ میں انتخاب مضامین میں بہ نسبت اور یونیورسٹیوں کے زیادہ وسعت رکھی ہے اور مضامین کو اس طرح سے مرتب کیا ہے کہ ایک طالب علم اپنے لئے ایک ایسا مجموعہ انتخاب کرسکتا ہے جس کے مضامین ایک دوسرے سے قریب کا تعلق رکھتے ہوں۔ مختلف مجموعوں میں مضامین کی تقسیم سے یہ فائدہ تصور کیا گیا ہے کہ بی اے میں ایک طالب العلم کسی خاص مضمون اور اس کے متعلقات کی تعلیم مکمل طریقہ پر حاصل کرسکے۔ انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہے اور اس کا وہی معیار ہے جو دوسری ہندوستان کی یونیورسٹی کا ہے۔ اس کے ساتھ جملہ فنون کی تعلیم زبان اردو میں دی جاتی ہے۔

ایک اور بڑی خصوصیت اس جامعہ کی یہ ہے کہ دینیات یا اخلاقیات کی تعلیم لازمی کیگئی ہے تاکہ مشرقی اخلاق کو مغربی علوم تباہ و برباد نہ کردیں۔ بہرحال یہ ایک ایسی یونیورسٹی ہے جو مشرق و مغرب کے علوم و فنون کے امتزاج کا بہترین مرکز ہے۔ منشور خسروی (رایل چارٹر) کو کاملاً یہاں درج کرنے کی عزت حاصل کی جاتی ہے:۔

منشور خسروی

چونکہ بندگان بدولت و اقبال کو اپنی عزیز و وفادار رعایا کی فلاح و بہبود بدرجۂ اتم مدنظر ہے اور یہ مقصد اعلیٰ صرف اس صورت میں بوجہ احسن حاصل ہوسکتا ہے جبکہ موجودہ انتظام تعلیم ممالک محروسہ سرکار عالی کو بیرونی جامعات (یونیورسٹیز) سے مناسب حد تک آزاد و مستغنی کرکے اعلیٰ تعلیم کا انتظام ملکی خصوصیات و حالات کے اعتبار سے خود اندرون ملک کیا جائے لہٰذا بندگان بدولت و اقبال حکم صادر فرماتے ہیں کہ:۔

(۱) حیدرآباد دکن میں ایک جامعہ (یونیورسٹی) بنام "جامعہ عثمانیہ" یکم محرم الحرام ۱۳۳۷ھ سے قایم کی جائے۔

(۲) جامعہ عثمانیہ کا مقصد یہ ہے کہ مذہبی۔ اخلاقی۔ ادبی۔ فلسفی۔ علمی۔ تاریخی۔ طبی

قانونی، زراعتی، تجارتی۔ اعلیٰ تعلیم کا اور دیگر مفید علوم و فنون و سود مند پیشوں اور صنعت و حرفت وغیرہ سکھانے اور ان سب میں تحقیقات و ترقی کا انتظام کرے۔

دفعہ ۳ جامعہ عثمانیہ کی خاص خصوصیت یہ ہوگی کہ جملہ علوم کی تعلیم زبان اردو میں دیجائیگی اور اسی کے ساتھ انگریزی زبان و ادب کی تعلیم بھی لازمی ہوگی۔

دفعہ ۴ جامعہ عثمانیہ مجاز و مقتدر ہوگی کہ :-

(الف) جملہ شاخہائے علوم و فنون کے لئے اپنی صوابدید کے لحاظ سے تعلیم و تدریس و تربیت کا انتظام کرے اُن کے حصول کے لئے ذرائع پہونچائے اور علوم و فنون کی عام تحقیقات و ترقی و اشاعت کا اہتمام کرے۔

(ب) اسناد (ڈگریز) اور دوسرے تعلیمی امتیازات اُن اشخاص کو عطا کرے جنھوں نے اس کے مجوزہ تعلیمی نصاب کو ختم کرکے اس کے مقررہ امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہو۔

(ج) اجازے (ڈپلوماز) یا صداقت نامے (سارٹیفیکٹس) یا دیگر امتیازات ان اشخاص کو عطا کرے جنھوں نے اس کے مجوزہ شرائط کے بموجب نصاب مقررہ کی تحصیل کی ہو۔

(د) دوسرے جامعات کے طیلسانین (گریجویٹس) کو اپنے یہاں کی اسناد اسی کی یا اسکے مماثل درجہ کے عطا کرے۔

(ہ) اعزازی اسناد یا دیگر امتیازات عطا کرے۔

(و) عطا شدہ سند اجازہ یا صداقت نامہ یا دیگر امتیازات کو مسترد یا منسوخ کرے۔

(ز) جملہ دیگر اختیارات اور کارروائیاں عمل میں لائے جو جامعہ کے حصول مقاصد و اجرائی کار کے لئے ضروری ہوں۔

دفعہ ۵ جامعہ عثمانیہ مجاز و مقتدر ہوگی کہ کسی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ کو جو اُس کے اغراض کے لئے اس کے حوالہ یا تفویض کی جائے بذریعہ اشتری عطا و وصیت یا دوسرے طور پر حاصل کرے، خریدی اور قبض و دخل میں رکھے اور اسی طرح وہ مقتدر و مجاز ہوگی کہ اپنی مملوکہ جائداد منقولہ اور غیر منقولہ یا اس کے کسی جز و کو عطا بیع علیحدہ یا کسی اور طور پر اس کے ساتھ عمل کرے اور نیز ایسے دوسرے اختیارات و امور عمل میں لاسکے گی جو جماعت مشترکہ کی حیثیت سے اس کو پیش آئیں یا اس سے متعلق ہوں۔

دفعہ ۶ جامعہ عثمانیہ مجاز و مقتدر ہوگی کہ بطور خود کلیہ (کالج) قائم کرے یا جو کلیات

اس کے لئے قائم کئے جائیں اس کے انتظام میں منتقل کئے جائیں یا جن کو وہ اپنے قاعدے کے لحاظ سے کلیہ کے حقوق عطا کرے اس کے متعلق اپنے جملہ اختیارات کو کام میں لائے اور ایسے کلیات اس کے اجزاء ترکیب متصور ہونگے۔

ف جامعہ عثمانیہ کی ہیئت ترکیبی حسب ذیل ہوگی:۔

مجلس اعلیٰ (کونسل)

مجلس رفقاء (سینٹ)

مجلس انتظامی (سنڈیکیٹ)

مجالس تعمیر (فیکلٹیز)

مجلس نصاب (بورڈز آف اسٹیڈیز)

ش بندگان اقدس واعلیٰ جامعہ عثمانیہ کے سرپرست اعلیٰ رہیں گے اور باقی مناصب و قوائے انتظامیہ حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) امیر جامعہ (چانسلر) یہ جامعہ کے سب سے اعلیٰ حاکم ہوں گے ان کو عام اختیار رہے گا کہ کسی وقت جامعہ کے کسی کلیہ، عمارت، و انتظام وغیرہ اور دوسرے متعلقات کے معائنہ و نگرانی کا حکم دیں ان میں کسی بابت کی تنقیح اس غرض سے کرائیں کہ جامعہ کے کاروبار منشور ہذا اور قواعد نافذہ تحت منشور ہذا کے بموجب عمل میں لائے جارہے ہیں۔ امیر جامعہ کو یہ اختیار بھی رہیگا کہ بذریعہ حکم تحریری کسی کارروائی کو منسوخ کریں جو اُن کی رائے میں منشور ہذا اور قواعد اور قواعد نافذہ تحت منشور ہذا کے بموجب نہ ہو مدارالمہام سرکار عالی بہ حیثیت عہدہ امیر جامعہ رہینگے

(۲) معین الامیر جامعہ (وائس چانسلر) ان کا درجہ امیر جامعہ کے بعد ہوگا اور معین المہام صیغہ تعلیمات یا وہ عہدہ دار جن سے جامعہ کا کام متعلق ہو۔ معین الامیر جامعہ ہوں گے اُن کی عام نگرانی جامعہ کے انتظام تعلیم پر رہے گی اور ان کا فرض ہوگا کہ وہ نظر رکھیں کہ منشور ہذا و قواعد نافذہ تحت منشور ہذا کی تعمیل کما حقہ ہوتی ہے بصورت ضرورت معین الامیر کو یہ اختیار بھی ہوگا کہ فوراً کوئی حکم صادر یا کارروائی عمل میں لائیں جس کو وہ اپنی صوابدید کے لحاظ سے ضروری تصور کریں اور اس کی اطلاع اس عہدہ دار کو کریں جو معمولی حالت میں معاملہ مذکور کے متعلق کارروائی کا مجاز ہو۔

(۳) مجلس اعلیٰ (کونسل) جامعہ عاملانہ انتظام و حکومت جس میں جامعہ کے متعلقہ کلیات کی تمام نگرانی اور ان پر اختیار رکھنا بھی داخل ہے مجلس اعلیٰ کے تفویض رہے گی مگر سرکار کو اختیار

رہیگا کہ قواعد نافذ کرکے اپنے واسطے ایسے اختیارات محفوظ کرلے جو عہدہ داروں کے تقرر برطرفی، سزا علیٰحدگی و رخصت سے متعلق ہوں۔ مجلس اعلیٰ میں نو سے کم اور گیارہ سے زیادہ ارکان نہ ہوں گے۔ مندرجہ ذیل اصحاب پر مجلس اعلیٰ مشتمل رہے گی۔

(۱) مدارالمہام سرکار عالی
(۲) معین المہام صیغہ تعلیمات یا وہ عہدہ دار جس سے جامعہ متعلق ہو۔
(۳) معین المہام امور مذہبی
(۴) معین المہام مالیہ (فنانس)
(۵) معتمد صیغہ تعلیمات
(۶) ناظم تعلیمات
(۷) صدر (پرنسپلز) کلیات جامعہ
(۸) بقیہ ارکان جن کا تقرر سرکار سے ہوگا
معتمد تعلیمات مجلس اعلیٰ کا معتمد رہے گا۔

(۴) مجلس رفقا (سینٹ) بہ متابعت منشور ہذا و قواعد و ضوابط نافذ الوقت جامعہ اور کلیات جامعہ کی ترکیب و تعلیم نصاب درس و امتحان و ترتیب طلبا و عہدہ دار اسناد معمولی و افزازی کے متعلق جملہ انتظامات کرے گی۔ مجلس رفقا کم سے کم چالیس اور زیادہ سے زیادہ ساٹھ ارکان پر مشتمل ہوگی۔ جن کی تعداد کا تعین وقتاً فوقتاً امیر جامعہ کریں گے اور یہ ارکان جامعہ کے رفقا (فیلوز) کہلائینگے۔ اور ان کے اختیارات و فرائض کی صراحت قواعد میں ہوگی۔ رفقا کا تقرر دو سال کے لئے ہوگا۔ پہلے ارکان مجلس رفقا اس مدت کے لئے سرکار سے مقرر ہوں گے۔ مدت مذکور کے ختم کے بعد مجلس مذکور میں حسب ذیل اصحاب شریک ہوں گے۔

(الف) معین الامرا جامعہ اور دوسرے ارکان مجلس اعلیٰ مندرجۂ فقرۂ (۳) اور
(ب) جامعہ کے علامہ (پروفیسرس) اور
(ج) چار ارکان منتخب کردہ مجلس رفقا جن میں دو ارکان طیلسانین مندرجہ فہرست سے اور دو ارکان مجالس شعبہ سے ہوں گے اور بقیہ ارکان جن کو امیر جامعہ مقرر کریں مگر شرط یہ ہے کہ رفقا کا تقرر اس طرح عمل میں آئے کہ مجلس رفقا میں تعداد غالب ان اشخاص کی رہے جن کا پیشہ تعلیم ہو یا اس سے تعلق رکھتے ہوں۔

(۵) مجلس انتظامی (سنڈیکیٹ) یہ مجلس رفقا کے کاروبار کی مجلس ہوگی اور اس کے ارکان پانچ سے کم اور سات سے زیادہ نہ ہوں گے اور اس کے اختیارات اور فرائض کی صراحت قواعد میں کی جائے گی۔

(۶) مجالس شعبہ (فیکلٹیز) یہ مجلس رفقا کی علمی مجلسیں ہونگی جن کی سپرد تعین نصاب و

تقرر امتحانات وغیرہ کا اہتمام ہوگا اور جو وقتاً فوقتاً حسب قواعد نافذہ مقرر کی جائیں گی اور ہر شعبہ علم وفن کے متعلق علیحدہ مجلس شعبہ قایم ہوگی۔

فی الحال جامعہ میں دو شعبہ ہوں گے شعبۂ دینیات اور شعبہ علوم وفنون ہر مجلس شعبہ کم از کم بارہ اور زیادہ سے زیادہ سولہ ارکان پر مشتمل ہوگی جن میں تعداد علامہ جملہ تعداد کے نصف سے کم از کم بقدر دو کے زیادہ ہوگی ہر مجلس شعبہ اپنے ارکان میں سے ایک شخص کو بطور میر شعبہ (ڈین) کے مقرر کرے گی۔ مجلس شعبہ مجاز ہوگی کہ کسی مسئلہ پر جو مجلس رفقا یا مجلس اعلیٰ اس میں بھیجے اس پر غور کرے اور کیفیت پیش کرے۔

(۷) مجلس نصاب (بورڈز آف اسٹڈیز) یہ دینیات و دیگر علوم وفنون ہر شاخ کے متعلق قایم ہونگی ان کے ارکان کے انتخاب کی تحریک، مجلس شعبہ کی طرف سے مجلس رفقا میں کی جائیگی۔ اور مجلس رفقا کی سفارش پر مجلس اعلیٰ سے تقرر کیا جائے گا ان کے ارکان جامعہ کے علامہ اور دوسرے اشخاص مقررہ ہوں گے کہ جو خاص واقفیت ومہارت ان علوم وفنون میں رکھتے ہوں جن کا تعلق اس مجلس نصاب سے ہو۔ مجلس نصاب کے فرایض یہ ہوں گے کہ وہ مجلس شعبہ میں کتب نصاب اور ایسے کتابوں کے لئے جن کا ترجمہ ضروری ہوا اور مضامین تعلیم اور ممتحن کے تقرر کے واسطے تحریک کرے اور جملہ امور پر جو منجانب مجلس شعبہ یا مجلس اعلیٰ انکے پاس بھیجے جاویں رائے ظاہر کرے۔

(۸) مجلس تنقیح (بورڈ آف آڈٹ) یہ مجلس جامعہ اور اس کی جائداد وغیرہ کے تمام حسابات متعلقہ کی تنقیح کی مجاز ہوگی۔ اس کا تقرر سالانہ مجلس رفقا کی طرف سے ہوا کرے گا اور ایسے تین ارکان پر مشتمل ہوگی جو رفیق ہوں۔ اور مجلس اعلیٰ کے رکن نہ ہوں۔ جامعہ کے جملہ حسابات کی تنقیح سالانہ منجانب سرکار بھی کی جائے گی۔ اور یہ تنقیح ایسا عہدہ دار کرے گا جس کو سرکار اس کام کے لئے مقرر کرے اور ایک تنقیح سے دوسری تنقیح تک (۱۵) ماہ سے زیادہ وقفہ نہ ہوگا۔ سرکاری تنقیح کنندہ جامعہ کے تمام حسابات اور دفتر کا معائنہ کرنے کا مجاز رہے گا۔

(۹) مسجل (رجسٹرار) مجلس رفقا ومجلس انتظامی کا معتمد بھی رہے گا۔ مسجل ان مجالس کا رکن ہوسکتا ہے۔ لیکن وہ مجلس اعلیٰ کا رکن نہ ہوسکے گا۔ اس کا تقرر مجلس اعلیٰ کی سفارش پر سرکار سے ہوا کرے گا۔ لیکن پہلے مسجل کو خود سرکار مقرر کرے گی۔

(۱۰) دیگر اشخاص یا جماعت جن کا ذکر قواعد نافذالوقت میں ہو۔

ف۹ بہ متابعت منشور ہذا و قواعد نافذ الوقت مجلس اعلیٰ مجاز ہوگی کہ بشرکت رفقاء جامعہ اور مناسب معلوم ہو تو نیز بشرکت دیگر اشخاص جو رفقا نہ ہوں ذیلی مجالس جامعہ کے انتظام یا دیگر معاملات یا کسی خاص شعبہ یا صیغہ یا کسی جائداد یا عمارت وغیرہ کی نگرانی کے متعلق مقرر کرے۔ اور ایسی مجالس کو مناسب اختیارات و فرائض تفویض کرے مجلس رفقا و مجالس شعبہ و مجالس نصاب کو بھی اختیارات کے اندر ایسی مجالس ذیلی کے تقرر کا اختیار رہے گا۔

ف۱۰ جامعہ عثمانیہ اپنے کاروبار میں ایسی مہر کا استعمال کرے جس کا نمونہ ما بدولت و اقبال منظور فرمائیں گے۔

ف۱۱ بہ متابعت منشور ہذا و قواعد نافذہ مجلس اعلیٰ مجاز ہوگی کہ وقتاً فوقتاً امور متعلقہ جامعہ کی نسبت قواعد و ضوابط بغرض تعمیل احکام و حصول مقاصد منشور ہذا مرتب و نافذ کرے یا قواعد مجریہ میں ترمیم یا اضافہ یا تبدیل یا تنسیخ عمل میں لائے۔ لیکن ہر ایسی ترمیم یا اضافہ یا تبدیل یا تنسیخ قبل نفاذ تابع منظوری سرکار رہے گی اور سرکار کو اختیار ہوگا کہ حکم مناسب اس کے متعلق صادر کرے۔ اول قواعد منجانب سرکار مرتب و نافذ ہوں گے۔

ف۱۲ مجلس رفقا مجاز ہوگی کہ جو قواعد مجلس اعلیٰ سے مرتب و جاری ہوں ان کے متعلق مسودات و تحریکات مجلس اعلیٰ میں پیش کرے اور مجلس اعلیٰ کا فرض ہوگا کہ ان پر غور کرے۔

ف۱۳ ہر قسم کے عطیات جو اغراض جامعہ کے لئے منجانب سرکار یا احکام مقامی یا دیگر اشخاص دیئے جائیں وہ بشمول ہر قسم کے دیگر آمدنی کے بطور سرمایہ کے رہے گی جس کا نام "سرمایہ جامعہ عثمانیہ" ہوگا یہ سرمایہ جامعہ کے اغراض مصرحۂ منشور ہذا کے لئے بہ اختیار جامعہ صرف کیا جائے گا۔

ف۱۴ مجلس اعلیٰ کو لازم ہوگا کہ ہر سال جامعہ کے حسابات کا موازنہ آمدنی و خرچ مرتب کرکے مجلس رفقا میں بھیجے اور اس کی رائے کے بعد بغرض منظوری سرکار میں پیش کرے اور سرکار کو اختیار ہوگا کہ حکم مناسب اس کے متعلق صادر کرے۔

ف۱۵ جامعہ اور اس کے مجالس انتظامی اور عہدہ داروں کے فرائض و اختیارات کی مزید تصریح قواعد میں کی جائے گی۔[1]

---

[1] جریدۂ غیر معمولی

شعبہ تالیف و ترجمہ

اردو یونیورسٹی کے لئے پہلا زینہ فراہمی کتب کا تھا اس کے لئے ضرور تھا کہ عظیم الشان پیمانہ پر شعبہ تالیف و ترجمہ قایم کیا جاتا۔

اگرچہ حیدرآباد کے لئے یہ کوئی نئی تحریک نہیں تھی اس کے پہلے دو مرتبہ ایسی تحریکیں بطور مناسب عالم وجود میں آئیں اور بہت کچھ کام بھی ہوا مگر اب نہایت وسیع و اعلیٰ پیمانہ پر شعبہ تالیف و ترجمہ کی بنا ڈالی گئی۔ اور معقول تعداد میں مترجمین و مولفین ایک ناظم کے ماتحت مامور کئے گئے کہ بطور مستقل اس اہم کام کی تکمیل ہو۔

اس شعبہ نے قابل تعریف طور پر اپنا کام انجام دیا ہے اور بدستور اپنے فرائض بجالا رہا ہے باوجود ان شدید مشکلات کے جو ترجمہ میں وضع اصطلاحات وغیرہ کی پیش آتی ہیں نہایت کامیابی کے ساتھ یہ کام جاری ہے۔

اس بیت الحکمت نے جو کام اب تک انجام دیا ہے وہ ان تمام مضامین سے متعلق ہے جن کی تعلیم اس وقت جامعہ عثمانیہ میں دی جا رہی ہے۔ حال میں شعبۂ طب و انجنیری کے کام بھی آغاز ہوئے ہیں۔

اب تک جس قدر کتابیں ترجمہ ہو کر اشاعت پا چکی ہیں اُن کی تعداد (اس وقت) ۶۹ ہے (۳۶) کتابیں ایسی ہیں جو زیر طبع ہیں (۱۵) کتابوں کی نظر ثانی ہو رہی ہے (۳۱) کتب زیر ترجمہ و تالیف ہیں اس طرح ان کی کل تعداد (۱۵۱) ہوتی ہے۔

اس تعداد میں ترجمہ و تالیف کے مختلف فنون کی کتابیں شامل ہیں جن میں تاریخ (مشرقی و مغربی قدیم و جدید) فلسفہ۔ معاشیات۔ ریاضیات (نظری و عملی) طبعیات۔ کیمیا اور قانون شامل ہیں۔

ایک فہرست فنون کے لحاظ سے درج کی جاتی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ ہر فن کی کتنی کتابیں ترجمہ یا تالیف ہوئیں۔

شمار	فن	تعداد	شمار	فن	تعداد
۱	تاریخ ہند	۶	۴	تاریخ ہند عہد برطانیہ	۶
۲	تاریخ ہند عہد ہنود	۴	۵	تاریخ انگلستان	۶
۳	تاریخ ہند عہد مسلمانان	۱۰	۶	تاریخ یورپ	۶

۷	تاریخ یونان	۸	۱۴	فلسفہ	۸
۸	تاریخ روما	۸	۱۵	قانون	۸
۹	تاریخ اسلام	۱۵	۱۶	ادب	۱
۱۰	جغرافیہ	۱	۱۷	ریاضی عملی و نظری	۱۰
۱۱	سیاسیات	۶	۱۸	طبیعیات	۲۲
۱۲	معاشیات	۴	۱۹	کیمیا	۹
۱۳	منطق	۴		جملہ	۱۵۱

کلیہ جامعہ عثمانیہ | تاریخ کے اوراق پر اگست ۱۹۱۹ء م ذیحجہ ۱۳۳۷ھ سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا جبکہ سب سے پہلے اردو کا عظیم الشان کالج "کلیہ جامعہ عثمانیہ" کا افتتاح ہوا۔ جلسہ کا دن کبھی فراموش نہیں ہوسکتا۔ حیدرآباد کے ایک بلند اور پرفضا مقام پر (جہاں آج کل کالج ہے) صبح کے دس بجے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صاحب نے بہ حیثیت معین الامیر جامعہ (وائس چانسلر) کے اس دارالعلم کا افتتاح فرمایا۔ مسٹر ولنکر پروفیسر انگریزی نے انگریزی علم ادب پر اس جلسہ میں ایک لکچر دیا۔ اور دوسرے دن سے باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی۔ طلبہ کا داخلہ ہمت افزا رہا پہلا امتحان انٹرمیڈیٹ ۱۹۲۱ء م ۱۳۳۹ھ میں ہوا۔ (۱۱۹) امیدواروں نے اپنے نام بھیجے مگر امتحان میں (۱۱۶) شریک ہوئے جن میں (۹۱) طلبہ کامیاب ہوئے۔ جو طلبہ امتحان میں بیٹھے اُن کے منجملہ (۹۷) کالج کے طلبہ تھے جن میں (۸۵) کامیاب ہوئے۔

امتحان میں باہر کے ممتحن بھی مقرر ہوتے ہیں ان کی رپورٹوں سے طلبہ کی تعلیمی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے تمام صاحبوں نے اس امر پر اطمینان ظاہر کیا ہے کہ طلبہ کو جو کچھ پڑھایا گیا ہے اس کو انھوں نے خوب سمجھ کر پڑھا ہے اور اُن کے جوابوں سے خیالات کی جدت اور تازگی ظاہر ہوتی ہے۔

اب تو کالج میں بی اے کے علاوہ ایم اے اور ایل ایل بی کی تعلیم کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے۔ کالج کے دو حصے ہیں ایک شعبۂ فنون اور دوسرا شعبۂ دینیات۔ شعبۂ فنون میں علاوہ علم ادب کے جملہ فنون کی تعلیم اردو زبان میں ہوتی ہے۔ سردست حسب ذیل علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ادب (انگریزی۔ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ اردو۔ کنڑی۔ مرہٹی

تلنگی) تاریخ (ہندوستان۔ انگلستان۔ اسلام۔ یورپ۔ قدیم و جدید) معاشیات ریاضی۔ طبعیات۔ کیمیا۔ منطق۔ فلسفہ۔
دوسرا شعبہ دینیات ہے۔ اس میں تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ منطق۔ فلسفہ وغیرہ کی تعلیم عربی زبان میں ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں انگریزی ادب لازمی ہے۔
کالج کے افتتاح کے بعد کچھ دن ناظم صاحب تعلیمات صدر کلیہ (پرنسپل) کا کام انجام دیتے رہے اس کے بعد عبدالستار صدیقی صاحب ایم اے (الہ آباد) پی ایچ۔ ڈی (گوٹنگن) صدر کلیہ مقرر ہوے جو مملکت آصفیہ کے تعلیم یافتہ اور آبائی سلک ملازمت سرکار عالی میں داخل تھے۔ مگر اب مولوی عبدالرحمان خاں صاحب بی اے بی ایس سی (لندن) صدر کلیہ ہیں جو ملک کے نامور سپوتوں میں
بہر حال اردو کی ترقی کے لئے یہ کالج ایک عظیم الشان یادگار ہے اور یہ دارالفنون اعلحضرت کا ایسا درخشاں کارنامہ ہے جس پر موجودہ اور آیندہ نسلیں ہمیشہ فخر و ناز کیا کرینگی اور اس سرچشمہ سے ایسے ایسے دریا رواں ہونگے جو دین اور دنیا کے چمنستانوں کو سیراب کردیں گے اور ساروہ میں علوم و فنون کی اشاعت سے حیدرآباد بغداد اور قرطبہ کا ثانی آکسفورڈ اور برلن کا جواب ہوگا اور انشاء اللہ المستعان تمام دنیا میں حکمت حقہ کا سب سے اہم اور عظیم الشان مرکز ہوگا۔ وہ دن اردو کے لئے کیا ہی مبارک و مسعود ہوگا جبکہ تمام علوم و فنون پوری تکمیل کے ساتھ اردو کے قالب میں نظر آئینگے اور دنیا کی اعلیٰ ترقی یافتہ زبانوں میں اس کا شمار ہوگا۔

اخبارات اور رسالے

اس دور میں اخبارات اور رسالوں کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوا ہو جن کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اس فہرست سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان رسالوں نے اردو زبان کی کس قدر خدمت کی ہے یہ تعداد بھی اس دور کی ایک خصوصیت ہے۔

شمار	نام	نوعیت	کیفیت
۱	مشیر دکن	روزانہ	اس کے متعلق قبل ازیں صراحت کیجا چکی ہے۔
۲	صحیفہ	"	" " "

۳	رہبر دکن	روزانہ	اسی دور میں اس روزانہ اخبار کی اجرائی ہوئی ہو مولوی محمد محی الدین صاحب اس کے اڈیٹر ہیں۔ بڑی تختی کے چار صفحہ پر شایع ہوتا ہے۔ خاص و عام میں ہر دلعزیز ہو رہا ہے۔
۴	راز	ہفتہ وار	یہ ایک ہفتہ وار اخبار ہو جس کے اڈیٹر مولوی احمد اللہ خاں قادری ہیں
۵	واعظ	”	مولوی عبدالوہاب صاحب عندلیب کی اڈیٹری میں ہفتہ وار شایع ہوتا ہے اس کا مقصد واعظین اضلاع و دیہات کے لئے مذہبی مضامین شایع کرنا ہے امور مذہبی کی جانب سے ایک کثیر تعداد اس کی اہل خدمات شرعیہ میں تقسیم کی جاتی ہے۔
۶	ثمرۃ الادب	ماہوار	انجمن ثمرۃ الادب دارالعلوم سے یہ ماہوار علمی اور اخلاقی رسالہ شایع ہوتا تھا۔ اکثر مدرسین اور طلبہ دارالعلوم کے مضامین اس میں ہوتے تھے۔ صرف ایک سال جاری رہا اور مولف کتاب ہذا نے جب اپنا تعلیمی سلسلہ موقوف کیا رسالہ بھی بند ہو گیا۔ اس ایک سال کے عرصہ میں اکثر اہل قلم اصحاب نے اس رسالہ میں اچھے اچھے مضمون لکھے تھے
۷	رسالہ اردو	سہ ماہی	یہ انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کا مشہور سہ ماہی رسالہ ہے جس کے اڈیٹر انجمن کے معتمد اور زبان اردو کے مشہور حامی و ہمدرد مولوی عبدالحق صاحب بی اے ہی ہیں۔ یہ رسالہ کمال خوبی کے ساتھ اردو کی جس قدر خدمت انجام دے رہا ہے وہ ناظرین سے مخفی نہیں ہے۔
۸	ترقی	ماہوار	یہ رسالہ ابوالمکارم محمد انوار اللہ صاحب کی اڈیٹری میں شایع ہونے لگا تھا افسوس ہے کہ صرف ایک سال کے بعد بند ہو گیا۔ مگر اس مختصر عرصہ میں اس رسالہ نے زبان اردو کی قابل قدر خدمت انجام دی اور اپنے بہترین اور اعلیٰ مضامین کے باعث ملک میں مقبول ہو گیا تھا
۹	النور	ماہوار	یہ ایک ماہوار مذہبی اور علمی رسالہ ہے جس میں تصوف اور مذہب کے بہترین مضامین شایع ہوتے ہیں اس کے اڈیٹر مولوی محمد باقر حسین صاحب طارق ہیں جو مولوی عبدالقدیر صاحب پروفیسر عثمانیہ کالج کی نگرانی سے شایع کرتے ہیں۔

۱۰	تاج	ماہوار	اس رسالہ کے اڈیٹر مولوی غلام محمد صاحب وفا ہیں۔ اس کے متعلق اڈیٹر "معارف" کی رائے ہے کہ: یہ رسالہ ہندوستان کے بعض مشہور پرچوں سے کم نہیں ہے۔ رسالۂ اردو کی رائے میں حیدر آباد کے کل پرچوں سے بہترین ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ملک کے اکثر انشاپرداز اس کے مضمون نگار ہیں جن کے اچھے اچھے مضمون اس میں شایع ہوتے ہیں۔
۱۱	لسان الملک	ماہوار	مولوی سید محمد ضامن صاحب ضامن کنتوری اس کے اڈیٹر ہیں مولوی صاحب ایک کہنہ مشق قدیم شاعر ہیں جن کے کلام کا نمونہ قبل ازیں دیا جا چکا ہے۔ مولوی صاحب کا اڈیٹر ہونا ہی اس رسالہ کی عمدگی و خوبی کی بیّن دلیل ہے۔
۱۲	رہبر تعلیم	ماہوار	سکندر آباد سے ماہوار علمی اور اخلاقی رسالہ شایع ہوتا ہے۔ اوسط درجہ کے مضامین ہوتے ہیں۔
۱۳	نظام کالج اردو میگزین	"	طلبہ نظام کالج نے ایک ماہوار رسالہ شایع کیا تھا جس کے چند نمبر عمدگی کے ساتھ شایع ہوے۔ مگر ایک سال کے اندر بند ہو گیا۔
۱۴	تحفہ	"	انجمن ارباب اردو سرور نگر کا ماہوار علمی اخلاقی رسالہ ہے۔ انجمن کے معتمد و ارکان کے اہتمام سے شایع ہوتا ہے۔ عموماً دکن کے اہل قلم اور خصوصاً طلبہ عثمانیہ کالج کے مضامین شایع ہوتے ہیں اس رسالہ کو جاری ہوے صرف چند ماہ کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس تھوڑی سی مدت میں اس نے اپنے وجود کو ملک کے لیے کار آمد ثابت کیا ہے امید ہے آگے چل کر ایک اعلیٰ بہترین رسالہ ثابت ہوگا۔
۱۵	النساء	ماہوار	صغریٰ بیگم "ہمایون" کی اڈیٹری میں ماہوار شایع ہوتا ہے۔ ملک کی نامور خواتین کے مضامین بھی شایع ہوتے ہیں خود بیگم ہمایون مرزا صاحبہ بھی کچھ کم مشہور نہیں ہیں جن کے تصنیف و تالیف سے کئی ایک کتابیں مشہور ہیں اس کتاب کے دوسرے حصہ میں انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے مضامین کا انتخاب پیش کیا جائے گا۔

١٦	خادمہ	ماہوار	مسز ولی الدین صاحب کی اڈیٹری میں شایع ہوا کرتا ہے خواتین کے لئے متوسط مضامین پیش کرتا ہے۔
١٧	نمایش	"	مولوی مرزا رفیق بیگ صاحب کی اڈیٹری میں شایع ہوتا ہے۔ پہلے تجارتی وصنعتی مضامین کے لئے مخصوص تھا مگر اب ادبی مضامین بھی شایع ہوتے اور اچھے شایع ہوتے ہیں۔
١٨	اتالیق	"	مولوی عبدالرب صاحب کوکب بچوں کے لئے ماہوار علمی اور اخلاقی رسالہ شایع کرتے ہیں ۔ سرکار کی جانب سے تمام ابتدائی مدارس میں تقسیم ہوتا ہے۔
١٩	نونہال	"	یہ بھی بچوں کے لئے مولوی مرغوب الدین صاحب شایع کرتے ہیں بچوں کے لئے دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔
٢٠	صراط المستقیم	"	یہ ایک مذہبی رسالہ ہے جو ابو الفدا مولوی نور محمد صاحب صدر مدرس مدرسہ دینیات کی اڈیٹری میں شایع ہوتا ہے۔
٢١	توحید	"	یہ بھی ایک دینی علمی رسالہ تھا جو سراج الدین صاحب کی اڈیٹری میں شایع ہوتا تھا۔
٢٢	المعلم	"	مولوی محمد حسین صاحب جعفری بی اے نائب ناظم تعلیمات کی نگرانی میں ماہوار شایع ہوتا ہے جس میں معلمین کے لئے بہترین مضامین اور طریقہ تعلیم کے قابل قدر نکتے بیان کئے جاتے ہیں مدرسین اور طلبہ کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہے ۔ غالباً اس نوعیت کا اردو زبان میں یہ پہلا رسالہ ہے جس کی اشاعت بھی دکن ہی سے ہوئی ہے۔
٢٣	المعالج	"	مولوی حکیم بشیر احمد صاحب کی اڈیٹری میں ماہوار شایع ہوتا ہے۔ جس میں بہترین طبی مضامین اور علاج کے مجرب وآزمودہ نسخے بیان کئے جاتے ہیں۔ حکیم صاحب اپنی حکمت کے باعث کافی شہرت رکھتے ہیں۔
٢٤	رہبر زراعت	"	مولوی مظہر حسین صاحب ایم اے ناظم زراعت کی نگرانی میں شایع

			ہوتا ہے جس میں زراعت کے متعلق مفید مضامین اور اسکی رپورٹیں شایع ہوتی ہیں۔
۲۵	المصدق	ماہوار	مہدوی اصحاب کا ماہوار رسالہ ہے جو مولوی سید محمود صاحب کلیمی کی اڈیٹری میں شایع ہوتا تھا۔

ان اخباروں اور رسالوں کے سوا سرکاری اخبارات جریدۂ اعلامیہ ہفتہ وار پولیس گزٹ اور وقایع مالگزاری ہفتہ وار بھی اردو میں شایع ہوتے ہیں۔

اردو کرنسی نوٹ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مملکت آصفیہ کی سرکاری زبان اردو ہو چکی ہے اس سے ظاہر ہے کہ جس قدر سرکاری کاروبار خواہ وہ کسی قسم کے ہوں اردو ہی میں ہونے لگیں گے مگر حقیقت میں اردو کی ترقی کا یہ بھی ایک قدم ہے کہ کرنسی نوٹ اردو میں جاری ہوگئے اور اردو کا سکہ کاغذ پر بھی چلنے لگا۔

بحمد اللہ یہ ناچیز تالیف ختم ہو چکی مجھے اعتراف ہے کہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے ہر طرح کامل نہیں ہے مگر یہ کہنا غالباً مبالغہ نہیں ہو سکتا کہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب اور بالکل ایک "نقش اول" ہے۔ مجھ جیسے کم مایہ نومشق مبتدی کے لئے یہ منزل بہت دشوار گزار تھی۔ میں نے اپنی استعداد کے مطابق جستجو اور تلاش سے جس قدر مواد فراہم ہو سکتا تھا جمع کرکے اس کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔

جیسا کہ میں نے قبل ازیں مقدمہ میں ظاہر کر دیا ہے یہ کتاب صفر ۱۳۴۲ء میں ختم ہو چکی تھی مگر اب دوران طبع میں بعض امور حسب ضرورت زیادہ کئے گئے ہیں۔ خصوصاً مرثیہ کے متعلق اس کتاب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے تقریباً وہ سب رسالہ لسان الملک سے ماخوذ ہے جس میں نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال کا مضمون داستان اردو شایع ہوا تھا درحقیقت میری کتاب نامکمل ہوتی اگر میں اس باب کا اضافہ نہ کرتا۔

مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں نے اپنی کتاب میں صنف لطیف کے کارناموں کو تقریباً متروک کر دیا ہے۔ انشاء اللہ آیندہ مکمل اور مستقل تالیف میں اس امر پر بحث کی جائیگی۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

ہاشمی